لوحِ خاک

احمد ندیم قاسمی

لوحِ خاک

نظمیں اور غزلیں

احمد ندیم قاسمی

اساطیر ✻ لاہور

اہتمام ــــ منصورہ احمد
(اساطیر، لاہور)

کتابت : محمد حسین (شاہ)

سرورق : مُوجد

مطبع : نفیس پرنٹرز، لاہور

تعداد : ایک ہزار

اشاعت اوّل : فروری ۱۹۸۸ء

قیمت : ۹۰ روپے

اساطیر
۴-میکلوڈ روڈ، لاہور-۶

لوحِ خاک

فہرس

مظفر بخاری

کے نام

ع تُو ساتھ ہو اور دُور کا درپیش سفر ہو

ندیم

حسنِ بے حساب

تمہارے حسن کو جتنے رخوں سے دیکھتا ہوں
شمار کرنے جو بیٹھوں، شمار کر نہ سکوں

اگر فقط مژہ ہائے دراز کا ہو بیاں
تو نیم دائرے اتنا ہجوم کرتے ہیں
کہ جن سے گردشِ سیارگاں بھی شرمائے

اگر حدیثِ لبِ شعلہ وش کہوں، تو مجھے
کئی ہزار مثالیں حصار میں لے لیں
اور اک مثال کا چُننا ہو اِس قدر دشوار
کہ میرا فن سپر انداز ہو کے رہ جائے

میں اپنے وقت کا تنہا حسابدانِ جمال،
تمہیں جو سامنے پاؤں تو سوچ میں پڑ جاؤں
کہ اتنا حسن مرے فن سے کیسے سمٹے گا
میں کائنات کو مُٹھی میں کیسے بند کر دوں

دسمبر ۱۹۷۸ء

○

ٹوٹتے جاتے ہیں سب آئینہ خانے میرے
وقت کی زد میں ہیں، یادوں کے خزانے میرے

زندہ رہنے کی ہو نیت تو شکایت کیسی
میرے لب پر جو گلے ہیں، وہ بہانے میرے

رخشِ حالات کی باگیں تو مرے ہاتھ میں تھیں
صرف میں نے کبھی احکام نہ مانے میرے

میرے ہر درد کو اس نے ابدیت دے دی
یعنی کیا کچھ نہ دیا مجھ کو، خدا نے میرے

میری آنکھوں میں چراغاں سا ہے مستقبل کا
اور ماضی کا ہیولیٰ ہے سرہانے میرے

گهر جوی را مژده کن تیره خاک
درخشند همی گوهرِ تابناک

تو نے احسان کیا تھا، تو جتا یا کیوں تھا
اس قدر بوجھ کے لائق نہیں شانے میرے

راستہ دیکھتے رہنے کی بھی لذّت ہے عجیب
زندگی کے سبھی لمحات سہانے میرے

جو بھی چہرہ نظر آیا، ترا چہرہ نکلا
تو بصارت ہے مری، یار پرانے میرے!

سوچتا ہوں، مری مٹّی کہاں اُڑتی ہو گی
اِک صدی بعد جب آئیں گے زمانے میرے

صرف اک حسرتِ اظہار کے پر تو ہیں ندیمؔ
میری غزلیں ہوں کہ نظمیں کہ فسانے میرے

دسمبر ۱۹۷۸ء

ایک یاد

بہت قریب سے گزری ہے آج یاد کوئی
کہ میرے چار طرف نکہتوں کی گونج سی ہے
ہَوا نشے میں ہے — سارا خلا گلابی ہے
تمام چاندنی، دریا! — تمام سبزہ، پہاڑ!
تمام سیم، سمندر! — تمام زر، صحرا!
تمام نور، فلک — اور تمام پھول، زمیں!
فضا تو خیر، مرا دل بھی منجمد نہ رہا
ستارے ٹانک دیے برف میں شعاعوں نے
شعاعیں، جو کسی سورج بدن سے نکلی ہیں،

دسمبر ۱۹۷۸ء

○
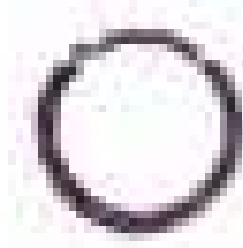
خوش ہُوا ہوں تو مجھے اشک فشاں ہونے دو
برف پگھلی ہے تو دریا کو رواں ہونے دو

صبح کے عشق میں طے کرنا ہے دشتِ شب بھی
آگ درکار اگر ہے، تو دُھواں ہونے دو

کچھ نہ بولو گے تو گھُل جاؤ گے شمعوں کی طرح
اپنی سوچوں کو زباں سے بھی بیاں ہونے دو

سہہ نہ پاؤ گے تو خود اس کو جھٹک ڈالو گے
غم کی سِل کو ابھی کچھ اور گراں ہونے دو

لوحِ خاک

۲۰

تم نہ ہو گے اگر اپنے ہی، تو کس کے ہو گے
اپنے وجدان پہ یہ رازِ عیاں ہونے دو

حاکموں سے نہیں، اللہ سے مانگے گی حقوق
میرے گھر کی نئی نسلوں کو جواں ہونے دو

پھول پت جھڑ بیں جو کھلتا ہے تو کھلنے دو ندیم
جو بھی ہونا ہے وہ ہو گا، مری جاں ہونے دو

دسمبر ۱۹۷۸ء

زمین سے دُور

یہاں سے اُڑ کے میں جب آسماں پہ جاؤں گا
بہت عجیب نظر آئے گی زمیں مجھ کو
وہ نیم دائرہ روشن، وہ نیم دائرہ فق
بس ایک نور کی قوس، اور ایک ظلمت کی
نہ فاصلوں کا تصوّر، نہ منزلوں کا شعور
نہ کوئی برِّ عظیم اور نہ کوئی بحرِ عظیم

مگر مرے لیے بامعنی اور پُرمایہ
کہ اس زمیں پہ، اِدھر یا اُدھر، کہیں نہ کہیں
ترے جمالِ حیات آفریں کے پرتَو سے
دلوں میں بوقلموں پھول کھل رہے ہوں گے

مرے لیے تو زمیں پر بس ایک ذات ہے — تُو!
اسی لیے تو مری ساری کائنات ہے — تُو!

دسمبر ۱۹۷۸ء

○

طیور سے نظر آتے ہیں جو درختوں پر

فضا کے پھول ہیں جو کھل رہے ہیں شاخوں پر

عجیب حسنِ مساوات ہے، کہ یکساں ہے

نوازش اوس کی، پھولوں پر اور پتوں پر

وہ جا چکا، مگر اب تک برستا رہتا ہے

اسی کا عکسِ شفق رنگ میری شاموں پر

میں ایک پل بھی جو بھولوں اسے تو مر جاؤں

اسی کے پیار کا پہرہ ہے میری سانسوں پر

زمیں کے غنچہ و گل ہی تو ماہ و انجم ہیں

ستارے کس نے اتارے کسی کے قدموں پر

ندیمؔ مجھ کو فرشتے سمجھ نہ پائیں گے

میں مشتمل ہوں ہزاروں لطیف جذبوں پہ

عجیب وقت پڑا اب کے باضمیروں پر

لبوں پہ پھول ہیں لیکن پہاڑ سینوں پر

خدا کرے، سفرِ عشق شب کو بھی نہ کٹے
اندھیرا ہاتھ نہ رکھ پائے میری آنکھوں پر

میں روشنی کی گزرگاہیں کیوں کروں مسدود
غلاف کون چڑھاتا پھرے دریچوں پر

عجیب چیز ہے انساں! عجیب اس کا خمیر!
عجیب رنگ کا سبزہ اُگا ہے قبروں پر

یہ کائنات — بغیرِ حیات — بے مفہوم
قدم زمین پہ رکھو، نظر ستاروں پر

ابھی خزاں مرے آنگن میں خیمہ زن ہے ندیمؔ
مگر پڑوس میں پھول اُگ رہے ہیں بیلوں پر

دسمبر ۱۹۷۸ء

ایک اسیرِ ذات سے

کب تک اپنے باہر سے، چشم بستہ بھاگو گے؟
کب تک اپنے اندر کی الجھنوں سے اُلجھو گے؟

کب تک اپنے شانوں پر اپنا بوجھ لادو گے؟
ہانپتے ہُوئے، آخر کتنی دور جاؤ گے؟

اپنے خول سے باہر جب نگاہ ڈالو گے
اپنی ذات کے اندر، کائنات دیکھو گے

اک بڑی مسافت ہے، اپنا تجزیہ کرنا
جنگلوں سے گزرو گے، پربتوں میں بھٹکو گے

ایک بار اگر کر لو، آپ احترام اپنا
اپنا عکس تکتے ہی، آئنے نہ توڑو گے

۲۵

رسم و راہِ فطرت سے دوستی اگر کر لو!
پت جھڑوں میں مہکو گے، آندھیوں میں چہکو گے

کھیت رقص کرتے ہیں، تال پر، ہواؤں کے
دل کی کھڑکیاں کھولو، تم بھی لہلہاؤ گے

ذہن کے سمندر میں چاند نور گھولے گا
جب سفینۂ جاں کے بادبان کھولو گے!

جنوری ۱۹۷۹ء

○
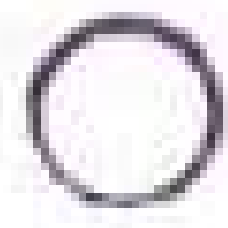
اپنے خوابوں کے کئی ارض و سما لے جائے گا
قبر میں انسان کیا اس کے سوا لے جائے گا

وقت کا طوفاں ہے حسن و سرخوشی کی تاک میں
دل سے جذبہ، ہاتھ سے رنگِ حنا لے جائے گا

پھول کی میت پہ کیوں سارا چمن ہے سینہ زن
کوئی جھونکا آئے گا، اس کو اُٹھا لے جائے گا

آدمی کے دَم سے آئینِ مشیت زندہ ہے
مر گیا تو ساتھ ہی اپنا خدا لے جائے گا

موجۂ بادِ صبا کی ہمسری اچھی — مگر
یہ تو ہر جانب تری آوازِ پا لے جائے گا

کوئی دیوانہ بکارِ خویش دیوانہ نہیں
نقشِ پا دے جائے گا اور آبلہ لے جائے گا

داورِ محشر کے ہاں، عصرِ رواں کا حکمراں
خون میں ڈوبی ہوئی اک۔ فاختہ لے جائے گا

اپنی بستی میں تو ہیں سب لوگ خوابیدہ ندیمؔ
اور کس کے در پہ کشکولِ صدا لے جائے گا؟

فروری ۱۹۷۵ء

تدفین

چار طرف سناٹے کی دیواریں ہیں
اور مرکز میں اک تازہ تازہ قبر کھدی ہے
کوئی جنازہ آنے والا ہے!
کچھ اور نہیں تو آج شہادت کا کلمہ سننے کو ملے گا
کانوں کے اک صدی پرانے قفل کھُلیں گے
آج مری قلاش سماعت کو آواز کی دولت ارزانی ہوگی!

دیواروں کے سائے میں اک بہت بڑا انبوہ نمایاں ہوتا ہے
جو آہستہ آہستہ قبر کی جانب آتا ہے
ان لوگوں کے قدموں کی کوئی چاپ نہیں ہے!
لب ہلتے ہیں لیکن حرف صدا بننے سے پہلے مر جاتے ہیں
آنکھوں سے آنسو جاری ہیں
لیکن آنسو تو ویسے بھی
دل و دماغ کے سناٹوں کی تمثالیں ہوتے ہیں!

لوحِ خاک

۲۹

میت قبر میں اُتری ہے

اور حدِ نظر تک لوگ بلکتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں

اور صرف دکھائی دیتے ہیں

اور کان دھرو تو سنّاٹے ہی سنائی دیتے ہیں

جب قبر مکمل ہو جاتی ہے

اِک بوڑھا

جو "وقت" نظر آتا ہے اپنے حلیے سے

ہاتھوں میں اُٹھائے کتبہ، قبر پہ جھکتا ہے

جب اُٹھتا ہے تو کتبے کا ہر حرف سسکنے لگتا ہے

یہ لوحِ مزار "آواز" کی ہے!

فروری ۱۹۷۹ء

○
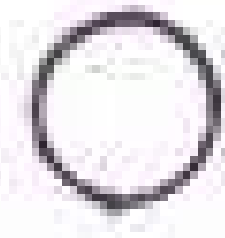
طوفاں ہے اگر گھر کے درپے، یوں بیٹھ نہ جاؤ، کچھ تو کرو!
کھڑکی کے شکستہ شیشے پر کاغذ ہی لگاؤ، کچھ تو کرو

انساں کے قبضۂ قدرت میں اک نطق نہیں ہے، بہت کچھ ہے
ہونٹوں سے نہ نکلے بات اگر آنکھوں سے سناؤ، کچھ تو کرو

محرومِ تمنا رہنے کا سناٹا کھا جائے گا تمہیں
مایوسی کے سکتے سے بچو، آنسو ہی بہاؤ، کچھ تو کرو

سلطاں کے قصرِ مرمر کا دروازۂ آہن بند سہی
گر توڑ نہیں سکتے اس کو، زنجیر ہلاؤ، کچھ تو کرو

اے جلتے ہوئے گھر کے لوگو! شعلوں میں گھرے کیا سوچتے ہو
جب آگ بجھانا مشکل ہے، باہر نکل آؤ، کچھ تو کرو

یہ کھیت جو چپ ہیں، بولیں گے، اور اکھوے آنکھیں کھولیں گے
بارش نہ سہی، بجلی ہی سہی، کچھ تو برساؤ، کچھ تو کرو

مارچ ۷۹ء

اِنکشاف

ابھی ابھی
اک عجیب احساس
میرے دل پر
کئی برس کی جمی ہُوئی گرد جھاڑ کر
مسکرا کے بولا
کہ اب اک آزاد قوم کے ایک فرد ہو تم!

یہ انکشاف اس طرح کا ہے
جیسے رات بھر سو کے
دوپہر کی تپش میں جب کوئی آنکھ کھولے
تو دھوپ بولے
کہ صبح آغاز ہو چکی ہے!

مارچ ۱۹۷۹ء

برف کا خوف

اگر برف گرتی ہے

گرتی رہے

آخرکار اُس کو

تمازت کی یلغار میں

یوں پگھلنا ہے

کچھ ایسی وارفتگی سے پگھلنا ہے

جیسے نہ پگھلی

تو پتّھر کی ہو جائے گی

مارچ ۱۹۷۹ء

تکمیل

زمیں آدھی تاریک ہے
آدھی روشن ہے!
سورج کبھی اِس طرف ہے
کبھی اُس طرف!
آدھی انسانیت سو رہی ہے
مگر آدھی بیدار ہے!

اور خدا،
جو فقط ایک ہے،
ان تضادات پر
اس تنوع پہ
آسودہ — !

ہر دائرے سے نیا دائرہ اس طرح پیدا کرتا چلا جا رہا ہے
کہ جیسے ابھی کائنات اپنی تکمیل پانے کی خاطر
تگ و دو میں ہے!

مارچ ۱۹۷۹ء

ایک بہار آفریں لمحہ

شش جہات ہیں رقصاں، نکہتِ بہاری ہے
ہر طرف مشیّت کا، فیضِ عام جاری ہے
ڈالیاں خمیدہ ہیں، جیسے رنگ بھاری ہے
گل فشاں درختوں نے، کیا زمیں نکھاری ہے!
آج تو افق بھی ایک سبز سبز دھاری ہے

یاد نے مرے دل میں، صورت اک اُبھاری ہے
ابروؤں میں خنجر ہیں، آنکھ میں کٹاری ہے
پھر بھی کتنی سیدھی ہے، اور کتنی پیاری ہے
چال ڈھال میدانی، رنگ کوہساری ہے
اس کا حسن، شہکارِ فنِ کردگاری ہے
کتنی بے کرانی ہے! کتنی بے کناری ہے
شش جہات ہیں رقصاں، نکہتِ بہاری ہے

مارچ ۱۹۷۹ء

○

صرف اک عزمِ سفر، زادِ سفر اپنا تھا
کبھی صحرائے تمنّا میں گزر اپنا تھا

میں اگر دشت سے گزرا، تو وطن سے گزرا
گھر جو بے در نظر آیا، وہی گھر اپنا تھا

میرے حصّے میں فقط نکہتِ آوارہ تھی
نہ چمن، اور نہ کوئی گلِ تر اپنا تھا

خود کو آئینے میں دیکھا تو میں مانندِ چراغ
اپنے ہی ہاتھ پہ رکھے ہوئے سر اپنا تھا

حسن سے یوں تو فرشتے بھی اثر لیتے ہیں
فرق یہ ہے — مرا اندازِ نظر اپنا تھا

سب پہ طاری تھا طلسمِ رخِ زیبا، لیکن
میں جو بے چین تھا اتنا، مجھے ڈر اپنا تھا

لوحِ خاک

۳۶

یوں تو تا حدِّ نظر اوج پہ تھی شعلہ زنی
جس نے اس گھر کو جلایا، وہ شرر اپنا تھا

آج وہ مجھ پہ بڑھا طعن بہ لب، سنگ بدست
اور اک روز وہی آئنہ گر اپنا تھا

جو بھی سنتا ہے، سمجھتا ہے، وہ خود بولا ہے
بات اس طرح سے کہنا ہی ہنر اپنا تھا

پیش غیروں کی طرح آئے ہیں اپنے بھی ندیمؔ
کوئی اپنا تھا تو اندر کا بشر اپنا تھا

مارچ ۱۹۷۹ء

وطن کے لیے ایک نظم

سارے رشتے ہیں وطن اور زمیں کے محکم
میں نے اُڑتے ہُوئے دیکھے ہیں یہ پرچم باہم
منعکس ہے اسی چہرے میں جمالِ عالم
میری تخلیق ہے مٹی سے، سو مٹی کی قسم
یہی مٹّی مری جنّت ہے، کہ اس مٹّی میں
چپّے چپّے سے جھلکتا ہے گلستانِ ارم
وقت جیسا بھی ہو، بیار اپنی عبادت میں مگن
دل کی دنیا میں بدلتے نہیں رہتے موسم
قدم اٹھیں تو ہیں دھڑکن دلِ منزل کی ستوں
سفرِ شوق میں ہوتی رہیں راہیں پُرخم
جن کو معلوم نہ تھا رازِ جہاں داریِ عشق
ترستیں ہیں انہی اقوام کی، تا حدِ عدم

میں تو یہ دیکھ کے پت جھڑ میں بھی ہنس دیتا ہوں

ایک پتّہ ہے سرِ شاخ ابھی مستحکم

کچھ طلب ہے تو بس اتنی، کہ وطن زندہ رہے

نہ ہوائے زر و گوہر، نہ غمِ دام و درم

اس کے کہسار بھی مخمل کی قبا میں ملبوس

اس کے صحراؤں کی ہے ریت بھی ریشم ریشم

گنگناتے ہُوئے چلتے ہیں ہوا کے جھونکے

اور کر جاتے ہیں غزلیں دلِ شاعر پہ رقم

دانش گاہ نے مجھے مطلوب ہے، جو صبح میں ہے

شاعری شام نہیں ہے کہ ہو مبہم مبہم

صبح — فطرت کی عدالت جو کھلی۔ تو دیکھا

خشک پتّوں سے بھی کتراتی نہیں ہے شبنم

مارچ ۱۹۷۹ء

ایک اور زلزلہ

باطن میں قیامت آ بھی چکی
ظاہر میں نہ جانے کب آئے
کب زلزلے سے ہل جائے زمیں
اور جھک جائے پربت کی جبیں
کب ٹکڑے چاند کے اُڑ جائیں
شہروں پہ سمندر چڑھ آئیں
کب گردشوں کے رُخ مڑ جائیں
کب وقت کے بے کل قدموں میں
یخ رات کی بیڑی پڑ جائے
یہ سارا کھیل اجڑ جائے

باطن میں تو یہ سب ہو بھی چکا
بے داغ ضمیر آلودہ ہوئے

بے چین دماغ آسودہ ہُوئے
پُر نور بصیرتیں بے نور ہُوئے
سب آئنہ خانے چور ہُوئے
ایماں کو ضرورت نگل گئی
ایقاں کو جبلت نگل گئی
انساں کا وجود اک صحرا ہے
جو سنّاٹے کی زد میں ہے
میدانِ حشر کی حد میں ہے

اب دل میں عقیدہ کوئی نہیں
دیدہ کہ شنیدہ — کوئی نہیں

اپریل ۱۹۷۹ء

کرب نامہ

کرب آمادۂ اظہار ہے ــــ لیکن آواز
میری سانسوں کی گزرگاہ سے گزرے کیسے!
حرف انبار در انبار پڑے ہیں بے جاں
جیسے کشتوں کے ہوں پشتے سرِ جنگاہِ حیات
شعر کہنے ہوئے اک عمر بسر کر دی ہے
لیکن اب جا کے کھُلا مجھ پہ یہ اظہار کا راز
شدّتِ کرب میں الفاظ بھی مر سکتے ہیں

چاند سُکڑا ہُوا، سہما ہُوا، جاتا ہوا چاند
دیکھتا ہے، کہ ستاروں کی لویں مدھم ہیں
اور ہر لَو میں ہے اک قطرۂ خوں کی تصویر
نہ خلاؤں میں گماں ہے کسی تابانی کا
نہ افق پر نظر آتی ہے اُجالے کی لکیر
رات کے جبر سے جب خامشی چِلّاتی ہے

تیز ہوتی ہُوئی چِڑیوں کی صدا آتی ہے
دشت و کہسار ہیں، ظلمات سے آلودہ ہُوا
صرف یہ بات بڑے دُرد سے کہہ پاتی ہے
چاند جب ڈوبتا ہے، چاندنی مر جاتی ہے

سیپیاں سی جو نظر آتی ہیں نیلی نیلی
اِن میں کل رات بصارت کے دیئے روشن تھے
وہ بصارت کہ جو فردا کا بھی نظّارہ کرے
اور ماضی کے دھندلکے بھی درخشاں کر دے
برگِ ہر گل پہ فروزاں جو لہو شبنم ہے
اس میں تاریخ نے پایا ہے کمالِ تجسیم
اور تاریخ وہ گمبھیر حقیقت ہے، جسے
وقت کی مصلحتیں قید نہیں رکھ سکتیں

میرے آدرش کے ٹکڑے ہیں کہ آئینے ہیں
ہاتھ اُٹھتے نظر آتے ہیں تو کٹتے سر بھی
آنچ دیتی ہے مری رُوح کی خاکستر بھی

جب سہارا کوئی چھوٹا تو ستارہ ٹوٹا
دل جو دھڑکا تو فلک میں ہُوئیں درزیں پیدا
جو قیامت مرے اندر ہے، وہی باہر بھی
اِس قدر عام ہے خونِ رگِ مظلوم کا فیض
موسم زرد میں گل رنگ ہُوئے پتھر بھی
غم اک آسیب کی صورت ہے مرے گھر پہ محیط
خیمہ زن ہے کوئی پرچھائیں مرے آنگن میں
چند سائے نظر آتے ہیں برونِ در بھی

ہم جو مظلوم ہیں، مجبور ہیں، بے مایہ ہیں
ہم جو سب دیکھ کے بھی بول نہیں پاتے ہیں
اور جب بولتے ہیں، نطق سے شرماتے ہیں
ہم ہیں پامال، مگر تیز ہوائے دم سے
پاؤں کے نقش، سروں تک بھی ابھر جاتے ہیں
ہم تو وارث ہیں شہیدوں کے جمالِ فن کے
وہ جو پیوندِ زمیں ہو کے، نکھر جاتے ہیں
اور نسلوں کے ضمیروں میں اُتر جاتے ہیں

۵ - اپریل

ایک نوحہ

شعور کی دھار تھا وہ احساس کی انی تھا
وہ طالبِ حسنِ زندگی تھا سو کشتنی تھا

اسی لیے تو اُداس چہرے چمک رہے ہیں
وہ نور ذہنوں کا تھا، ضمیروں کی روشنی تھا

فرازِ دار و رسن سے اس کا مقام پوچھو
کہ اس کا معیارِ عشق کس درجہ آہنی تھا

میں اُس کی تر دامنی کی سوگند کھا رہا ہوں
کہ وہ تو دل کا غنی تھا اور بات کا دھنی تھا

تم اس کی آواز پارہ پارہ نہ کر سکو گے
کہ جسم تو خیر جسم تھا اور شکستنی تھا

لہو لہو پتّیوں سے شب سرخ ہو رہی تھی
کہ ایک گُل کا یہ آخری رقصِ جاں کنی تھا

۵ - اپریل ۱۹۷۹ء
(شب)

○

اگر فرشتہ مرے غم سے آشنا ہو جائے
زمیں، مدار سے ہٹ کر کہیں ہوا ہو جائے

تنا ہُوا ہے مرے چار سُو وہ سنّاٹا
کہ جس میں سانس بھی بھونچال کی صدا ہو جائے

یہ معجزہ ہے مرا، یا مرے ضمیر کا زہر
میں شاخِ گُل کو جو چھُو لوں تو اژدہا ہو جائے

بہت سا قرض مشیّت کا ہے مرے سر پر
میں سر ہی کیوں نہ کٹا دوں کہ کچھ ادا ہو جائے

بقا اسی کو تو کہتے ہیں جب کوئی انساں
برائے عظمتِ انسانیت، فنا ہو جائے

نہ ہو سکا کبھی عریاں کوئی دریدہ لباس
خود اپنا خون ہی منصور کی قبا ہو جائے

وفورِ فصلِ بہاراں کا ہے شہید وہ پھول
کہ جس سے بو کی طرح، رنگ بھی جدا ہو جائے

دیا جلے تو کرے گھر کے بام و در روشن
جو گھر جلے تو اندھیرے کی انتہا ہو جائے

مرض ہی حریتِ فکر کا کچھ ایسا ہے
کہ جو بھی فکر کرے اس میں مبتلا ہو جائے

اگر بتاؤں کہ میں سوچتا ہوں کیا کیا کچھ
نظامِ کون و مکاں جانے کیا سے کیا ہو جائے

تنہا ہے تا بہ ابد میرا دشتِ تنہائی
ندیمؔ اب تو مرا ہمسفر خدا ہو جائے

مئی ۱۹۷۹ء

○
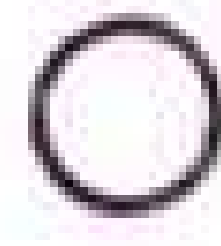
قلم دل میں ڈبویا جا رہا ہے
نیا منشور لکھا جا رہا ہے

اُجالے بٹ رہے ہیں قاش در قاش
اندھیروں کو سنوارا جا رہا ہے

میں کشتی میں اکیلا تو نہیں ہوں
مرے ہمراہ دریا جا رہا ہے

کہیں تھمتی نہیں چشمِ تماشا
جو نظارہ ہے، گزرا جا رہا ہے

سلامی کو جھکے جاتے ہیں اشجار
ہوا کا ایک جھونکا جا رہا ہے

قیامت سی بپا ہے شاخ در شاخ
شجر سے ایک پتا جا رہا ہے

۴۸

مسافر ہی مسافر ہر طرف ہیں
مگر ہر فرد تنہا جا رہا ہے

شبِ فرقت کے تارے بجھ رہے ہیں
صدی کا ساتھ چھوٹا جا رہا ہے

میں اک انساں ہوں یا سارا جہاں ہوں
بگولا ہے کہ صحرا جا رہا ہے

رواں ہوں میں ستارہ در ستارہ
زمیں پر میرا سایہ جا رہا ہے

ندیمؔ اب آمد آمد ہے سحر کی
ستاروں کو بجھایا جا رہا ہے

جولائی ۱۹۷۷ء

○
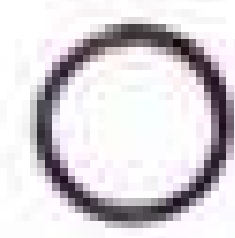
نئے انساں کے عجب تیور ہیں
نغمہ بر لب، مگر آنکھیں تر ہیں

لوگ بے چہرہ ہیں، گھر بے در ہیں
عصرِ نو کے بھی وہی منظر ہیں

گل بدست آئے سبھی راہ نما
ان کے ذہنوں میں مگر پتھر ہیں

یہ بھی اک طرح کی محکومی ہے
کہ ہم آزاد ہیں۔ اور بے پر ہیں

برجِ خاک

۵۰

کوئی جینے کا سلیقہ بھی سکھائے
مجھ کو مرنے کے سبق ازبر ہیں

رائیگاں جائے گا سورج کا عتاب
سبز اشجار مرے اندر ہیں

اُس کو کیا خوف، نہ ہونے کا ندیمؔ
جس کو ہونے کے ہزاروں ڈر ہیں

جولائی ۱۹۷۹ء

○

بچھڑ کے بھی میں ترے پرتوِ وصال میں ہوں
جہاں بھی جاؤں ترے ہالۂ جمال میں ہوں

یقیں نہ آئے تو آئینہ آنا میں دیکھ!
ترے خیال میں ہوں یا ترے خد و خال میں ہوں

ترے بدن کے سبھی گُل کھلائے ہیں میں نے
لہو کی طرح رواں تیری ڈال ڈال میں ہوں

تری تلاش میں عالم عجب نشاط کا تھا
جو تُو ملا تو ترے ہجر کے ملال میں ہوں

صدا کی طرح تری آرزو کمال پہ ہے
یہ اور بات کہ میں عمر کے زوال میں ہوں

کُھلی فضا کے لیے خاک کا قفس توڑا
مگر ندیمؔ ابھی آسماں کے جال میں ہوں

اگست ۱۹۷۹ء

تنہائی

میں نے کل رات کے سنّاٹے میں
ایک دلدوز مسافت طے کی!
میں سمجھتا تھا، ابد کا کوئی ساحل ہی نہیں
اور مرے سامنے ساحل تھا
جہاں وقت کے قدموں کے نشاں تک بھی نہ تھے
کچھ بھی موجود نہ تھا!
میں بھی موجود نہ تھا!!

اگست ۱۹۷۹ء

حجاب

ریت صحراؤں کی، تپتی ہے تو چلاتی ہے :

میرے اندر بھی تو گلزار اُگانے کی اُمنگیں ہیں

جو پوری نہیں ہوتیں تو سلگ اُٹھتی ہیں

کوہساروں سے صدا آتی ہے :

سنگ میں رنگ تو ہوتے ہیں

مگر سنگ کے سینے میں اُتر جاؤ

تو خوشبو سے بھی خالی نہیں پاؤ گے اُسے

برف کہتی ہے :

فقط یخ نہیں پیکر میرا

مجھ کو پگھلا کے بہاؤ تو بھڑک اُٹھوں گی

اور برفاؤں گی، دمکاؤں گی، گرماؤں گی

ہم جو مٹی کے کھلونے نظر آتے ہیں

اگر کوئی کریدے تو اسی مٹی میں

ذرّے ذرّے سے اُمڈتے ہوئے انوار بھی ہیں

ڈھیر رنگوں کے بھی

خوشبوؤں کے انبار بھی ہیں

ایسے کردار بھی ہیں

جیسے سرما میں سجل دھوپ کا، گرما میں گھنی چھاؤں کا

کردار ہُوا کرتا ہے

وہی سب کچھ

جسے ہم پیار کا اعجاز بھی کہتے ہیں

جو صورت گرِ کونین نے

تخلیقِ دو عالم میں سمویا تھا فراوانی سے

اگست ۱۹۷۹ء

افلاکِ زمینی

آسمانوں کی طرف مت دیکھو
آسمانوں میں تو اتنی سی حقیقت بھی نہیں
کہ کسی لمس کو ممنون کریں
اور انسان جسے چھُو نہیں سکتے
اُسے تسلیم کہاں کرتے ہیں!
آسمانوں سے پرے ہے حدِ امکانِ رسائی ان کی
آسماں کچھ بھی نہیں
وہ حقیقت میں بصارت کی رسائی کے افق ہیں
وہ خلاؤں کے عمق ہیں
وہ بلاوا ہیں
مگر صرف بلاوا ہیں
فقط گونج ہیں

اور گونج فقط عکس ہے آوازوں کا

آسمانوں کی طرف مت دیکھو

تم زمیں پر ہو تو اُس تک حدِ امکانِ رسائی پھیلاؤ

اس کی مخلوق کو دیکھو کہ جو چہروں میں، دماغوں میں، دلوں اور

ضمیروں میں کئی رنگ کے افلاک لیے پھرتی ہے

انہی افلاک کو چھونے کا کوئی چارہ کرو

اپنی بھرپور توانائی کو

آسمانوں کے سرابوں میں نہ آوارہ کرو

اگست ۱۹۷۹ء

○
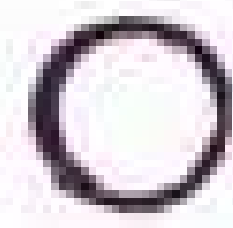
اپنے ماحول سے بچھڑے قیس کے رشتے کیا کیا
دشت میں آج بھی اُٹھتے ہیں بگولے کیا کیا

عشق معیارِ وفا کو نہیں کرتا نیلام
ورنہ ادراک نے دکھلائے تھے رستے کیا کیا

جیسے ہم آدم و حوّا کی سزا بھول گئے!
ورغلاتے رہے جنّت کے نظارے کیا کیا

سائے کا ساتھ بھی جب چھوٹ گیا ظلمت میں
یاد آتے رہے مجھ کو مرے پیارے کیا کیا

یہ الگ بات کہ برسے نہیں، گرجے تو بہت
ورنہ بادل مرے صحراؤں پہ اُمڈے کیا کیا

آگ بھڑکی تو در و بام ہوُے راکھ کے ڈھیر
اور دیتے رہے احباب دلاسے کیا کیا

کسی بدبخت سے جب دل کا دیا بھی نہ جلے
آسمانوں سے اترتے ہیں اندھیرے کیا کیا

لوگ اشیا کی طرح بِک گئے اشیاء کے لیے
سرِ بازار تماشے نظر آئے کیا کیا

کہیں قبروں کے نشاں ہیں کہیں قدموں کے نشاں
کارواں زیست کی شاہراہ سے گزرے کیا کیا

گونج اُٹھتا دلِ انساں تو کوئی بات بھی تھی
گوشِ انساں میں انڈیلے گئے دعوے کیا کیا

لفظ کس شان سے تخلیق ہُوا تھا لیکن
اس کا مفہوم بدلتے رہے نقطے کیا کیا

اِک کرن تک بھی نہ پہنچی مرے باطن میں ندیمؔ
سرِ افلاک دمکتے رہے تارے کیا کیا

اگست ۱۹۷۹ء

تمازتِ عصر

اس قدر تیز تمازت میں کوئی کیا بولے
بول ہونٹوں پہ جب آتا ہے تو بھُن جاتا ہے
ایک اِک حرف پہ ہوتا ہے شرارے کا گماں
ایک اِک لفظ الاؤ سا نظر آتا ہے

سلگ اُٹھتا ہے جب اظہار کا دامانِ حریر
سننے والوں پہ برس جاتی ہے مفہوم کی راکھ
یوں نہ مفلوج ہوئی تھی کبھی شعروں کی زباں
یوں بگڑتی کبھی دیکھی تھی نہ فن کار کی ساکھ

قدر دانو! میں کہاں تک سرِ بازارِ حیات
فن کو اور اس کے مفاہیم کو جلتا دیکھوں
میں نے مانا کہ سخن فہم و ہنر پرور ہو
اس تمازت کو بجھا لوں تو غزل عرض کروں

اگست ۱۹۷۹ء

○
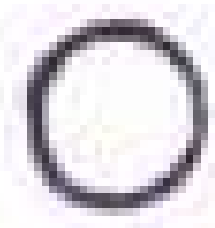
اتنا دشوار نہیں موت کو ٹالے رکھنا
سر جو کٹ جائے تو دستار سنبھالے رکھنا

چوٹ کھانا، مگر اس طرح کہ لَو دے اُٹھے
ظلمتِ غم اسی تارے سے اُجالے رکھنا

اپنے احباب کو سینے سے لگائے پھرنا
ایک خنجر بھی مگر جیب میں ڈالے رکھنا

میری پہچان مرے پیرہنِ زخم سے ہے
اب بھی اعزاز سہی شال دوشالے رکھنا

دشتِ احساس کی حدّت بھی قیامت ہے ندیمؔ
کچھ ضروری تو نہیں پاؤں میں چھالے رکھنا

اکتوبر ۱۹۷۹ء

○
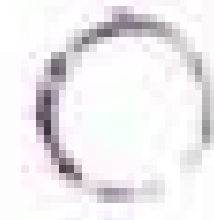
میری محدود بصارت کا نتیجہ نکلا
آسماں میرے تصوّر سے بھی ہلکا نکلا

روزِ اوّل سے ہے فطرت کا رقیب آدم زاد
دھوپ نکلی تو مرے جسم سے سایا نکلا

جب بھی اُٹھا کوئی فتنہ، مجھے محسوس ہُوا
کہ جو ابلیس کا دعویٰ تھا، وہ سچا نکلا

سرِ دریا تھا چراغاں کہ اجل رقص میں تھی
بلبلا جب کوئی ٹوٹا تو شرارا نکلا

بات جب تھی کہ سرِ شام فروزاں ہوتا
رات جب ختم ہُوئی، صبح کا تارا نکلا

مدّتوں بعد جو رو یا ہوں، تو یہ سوچتا ہوں
آج تو سینۂ صحرا سے بھی دریا نکلا

کچھ نہ تھا، کچھ بھی نہ تھا، جب مرے آثار کھدے
ایک دل تھا، سو کئی جگہ سے ٹوٹا نکلا

لوگ شہپارۂ یک جائی جسے سمجھے تھے
اپنی خلوت سے جو نکلا تو بکھرتا نکلا

میرا ایثار مرے زعم میں بے اجر نہ تھا
اور میں اپنی عدالت میں بھی جھوٹا نکلا

وہی بے انت خلا ہے، وہی بے سمت سفر
میرا گھر میرے لیے عالمِ بالا نکلا

زندگی ریت کے ذرّات کی گنتی تھی ندیمؔ
کیا ستم ہے! کہ عدم بھی وہی صحرا نکلا

نومبر ۱۹۷۹ء

○
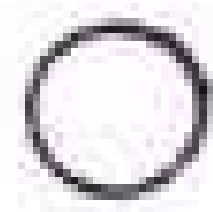
کبھی ہیرے کبھی پکھراج میں ڈھلنے والے
ہم نے پتّھر بھی چُنے رنگ بدلنے والے

اب کے گلزار پہ یوں ٹوٹ پڑا رنگِ بہار
جیسے ہر پھُول سے شعلے ہوں نکلنے والے

رات آنسو امڈ آئے تو عجب منظر تھا
ہم نے دیکھے مہ و انجم بھی پگھلنے والے

نارِ نمرود کی کیا ان کو ضرورت ہو گی
اپنی حدّت ہی میں جل جاتے ہیں جلنے والے

خشک کے ٹیلوں پہ اُتر آئی ہیں پیاسی چڑیاں
جیسے صحراؤں میں چشمے ہوں اُبلنے والے

وقت احکام سے زنجیر نہیں ہو سکتا
آنے والے ہیں جو لمحے، نہیں ٹلنے والے

کبھی خورشیدِ قیامت بھی تو نکلے گا ندیمؔ
دھوپ سے ڈرتے رہیں سائے میں چلنے والے

فروری ۱۹۸۰ء

○
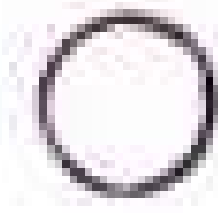
سطح پر آج تو پتھر بھی اُبھرنا چاہیں
اِک ہم انسان ہیں جو ڈوب کے مرنا چاہیں

اپنے سر پھوڑ لیں، یا موم کریں پربت کو
لوگ جلدی میں ہیں، کچھ فیصلہ کرنا چاہیں

سرِ گلزار لیے بیٹھے ہیں چھلنی تلوے
ہم، جو کلیوں پہ کبھی پاؤں نہ دھرنا چاہیں

مادرِ خاک کی آغوش سے بچھڑے ہُوئے پھول
سینۂ خاک پہ گر گر کے نکھرنا چاہیں

کتنے فن کار ہیں وہ لوگ جو پیارے ہیں ندیمؔ
شعر کی طرح لہو تک میں اُترنا چاہیں

فروری ۱۹۸۰ء

بدستور

جھٹپٹے کے غرفے میں لمحے اب بھی ملتے ہیں
صبح کے دھندلکے میں پھول اب بھی کھلتے ہیں

اب بھی کوہساروں پر
سر کشیدہ ہریالی
پتھروں کی دیواریں،
توڑ کر نکلتی ہے،

اب بھی آب زاروں پر کشتیوں کی صورت میں
زیست کی توانائی، زاویے بدلتی ہے

اب بھی گھاس کے میداں
شبنمی ستاروں سے
میرے خاک داں پر بھی
آسماں سجاتے ہیں

اب بھی کھیت گندم کے تیز دھوپ میں تپ کر
اس غریب دھرتی کو زر فشاں بناتے ہیں

سائے اب بھی چلتے ہیں
سورج اب بھی ڈھلتا ہے
صبحیں اب بھی روشن ہیں
راتیں اب بھی کالی ہیں

ذہن اب بھی چٹیل ہیں روحیں اب بھی بنجر ہیں
جسم اب بھی ننگے ہیں ہاتھ اب بھی خالی ہیں

اب بھی سبز فصلوں میں
زندگی کے رکھوالے
زرد زرد چہروں پر
خاک اوڑھے رہتے ہیں

اب بھی ان کی تقدیریں منقلب نہیں ہوتیں
منقلب نہیں ہوں گی کہنے والے کہتے ہیں

گردشوں کی رعنائی
عام ہی نہیں ہوتی
اپنے روزِ اوّل کی
شام ہی نہیں ہوتی

مارچ ۱۹۸۰ء

فن اور غیر فن

ابابیلوں نے
نیلے آسمانوں پر
اڑانوں سے
عجب قوسیں بنائی ہیں!
اگر یہ سب کی سب قوسیں
ہنرمندانِ فن کے مُوقلم چُن لیں
تو کوئی بھی انھیں شہپارۂ فن کیسے مانے گا
کہ فن
اس عصرِ بے محور میں
اس ہنگامۂ ابہام میں
اس لمحۂ تجرید میں

لوحِ خاک
۶۹

اتنا حسین
اتنا کھرا
اتنا حقیقی
اور صداقت کے قریب ہو گا
تو وہ کچھ اور ہو گا
فن نہیں ہو گا!

مارچ ۱۹۸۰ء

وطن کے لیے ایک دعا

خدا کرے — کہ مری ارضِ پاک پر اُترے
وہ فصلِ گل، جسے اندیشۂ زوال نہ ہو

یہاں جو پھول کِھلے، وہ کِھلا رہے صدیوں
یہاں خزاں کو گزرنے کی بھی مجال نہ ہو

یہاں جو سبزہ اُگے، وہ ہمیشہ سبز رہے
اور ایسا سبز، کہ جس کی کوئی مثال نہ ہو

گھنی گھٹائیں یہاں ایسی بارشیں برسائیں
کہ پتھروں سے بھی، روئیدگی محال نہ ہو

خدا کرے — کہ نہ خم ہو سرِ وقارِ وطن
اور اس کے حسن کو تشویشِ ماہ و سال نہ ہو

ہر ایک فرد ہو تہذیب و فن کا اوجِ کمال
کوئی ملول نہ ہو، کوئی خستہ حال نہ ہو

خدا کرے — کہ مرے اک بھی ہموطن کے لیے
حیات جرم نہ ہو، زندگی وبال نہ ہو

خدا کرے — کہ مری ارضِ پاک پر اُترے
وہ فصلِ گُل جسے اندیشۂ زوال نہ ہو

مارچ ۱۹۸۰ء

حشر

خدایا!
اب کوئی مخلوقِ نو تخلیق کر
انسان کی تخلیق تیری آخری تخلیق کیسے ہے!
کہ تیرے کائناتی دائروں میں
ہر گھڑی گردش نہ ہو تو محوروں کی دھجیاں اُڑ جائیں
جیسے انساں
اَن گنت صدیوں کی یکسانی سے اُکتا کر
کسی لمحے —
کسی بھی بے بصر لمحے
خود اپنی دھجیاں ہاتھوں میں لے کر
تیرے در پر آنے والے ہیں!

مارچ ۱۹۸۰ء

○

عجیب رنگ ترے حسن کا، لگاو میں تھا
گلاب جیسے کڑی دھوپ کے الاؤ میں تھا

ہے جس کی یاد مری فردِ جرم کی سرخی
اسی کا عکس مرے ایک ایک گھاؤ میں تھا

یہاں وہاں سے کنارے مجھے بلاتے رہے
مگر میں وقت کا دریا تھا اور بہاؤ میں تھا

عروسِ گل کو صبا جیسے گدگدا کے چلے
کچھ ایسا پیار کا عالم ترے سبھاؤ میں تھا

میں پُرسکوں ہوں، مگر میرا دل ہی جانتا ہے
جو انتشار محبت کے رکھ رکھاؤ میں تھا

غزل کے روپ میں تہذیب گا رہی تھی ندیمؔ
مرا کمال مرے فن کے اس رچاؤ میں تھا

اپریل ۱۹۸۰ء

زندگی کے لیے ایک نظم

زندگی!
میں کہاں تک ترے اک چراغِ گریزاں کا پیچھا کروں
زندگی!
میرے تلووں میں اتنے پھپھولے ہیں
جتنے ترے گزرے لمحات ہیں!
زندگی!
میرے اندر جو تنہائیوں کے خلا ہیں
وہ تیری عطا ہیں!
میں زندہ رہا تو ترے نام کی لاج رکھنے کو زندہ رہا
ورنہ مرنا تو ــــ
اے زندگی!

—اتنا آسان ہے

جتنا دشوار ہے زندہ رہنا!

زندگی!

اب میں تھک سا گیا ہوں

مجھے حسنِ انساں بھی

اور حسنِ فطرت بھی

اور حسنِ تخیل بھی

کچھ ادھورے سے لگتے ہیں

جھومر میں جیسے فقط ایک نگ کی کمی

پورے جھومر کی تکمیل پر حرف لاتی ہے!

ہر چیز پژمردہ ہے

اب نیا پھول بھی اپنی خوشبو کو زنجیر کہتا ہے

اور ایسی زنجیر میں قید رہنے سے افسردہ ہے!

آج میں رات بھر صبح کی راہ تکتا رہا

اور جب صبح آئی

تو جیسے وہ مریم ہے

جو رات بھر

اپنی پاکیزگی کے حصاروں میں روتی رہی ہے !

میں اب ڈر کے مارے نگاہیں جھکا کر ہی چلتا ہوں

اب سامنے دیکھنا اک بڑا کرب ہے

سامنے ایک ملبہ ہے — !

ٹوٹے ہوئے در ہیں

(یعنی مرے خواب ہیں)

اور کچلے ہوئے سر ہیں

(جو نیر مرے برتاؤ ہیں)

اور ان سب پہ بکھری ہوئی

آسمانوں کے بلّور کی کرچیاں ہیں !

زندگی !

تو بہت خوبصورت سہی

تجھ سے میری محبت بھی کم خوبصورت نہ تھی !

میں نے ہر جسم میں

اور ہر عکس میں

اور ہر سائے میں

تیرے پر تو اُجاگر کیے

میں نے انسان کو تجھ سے اک والہانہ محبت کی تلقین کی

مرنے والوں کے حق میں دعا کی تو یہ کی

کہ وہ دوسری زندگی — دائمی زندگی میں

سلیقے سے زندہ رہیں

موت کے خوف کے ختم ہونے پہ بھی

حسن و خیر اُن کا کردار ہو

ان کا اپنا ضمیر ان کا معیار ہو!

زندگی!

اب تو میرے قریب آ

مجھے لمس کی حدّتیں بخش

میرے لہو میں اُتر

اور میری تھکن کو سمیٹ اس طرح
جیسے جاتا ہُوا آفتابِ جہاں تاب
اپنی شعاعیں سمیٹے !

مئی ۱۹۸۰ء

○
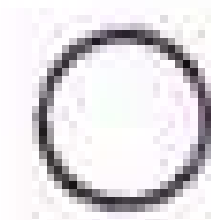
عجب جہانِ طلسمات میرے اندر تھا
میں مشتِ خاک سہی، روح کا سمندر تھا

اب آئے اور زرِ دل سمیٹ کر لے جائے
جو میرا دوست تھا، جو میرا کیمیا گر تھا

حسین وہی تو رہے گا جو نارسا بھی رہے
قریب جا کے جو دیکھا، ستارہ پتھر تھا

نرالا عذر تراشا تھا مسخ چہروں نے
کہ اس دیار کا ہر آئنہ مکدر تھا

۸۰

کچھ ایسے ختم ہوئی عمر بھر کی تنہائی
کہ میرے چار طرف دشمنوں کا لشکر تھا

گماں یہ تھا کہ وہ تھک کر شجر پہ اُترا ہے
اُڑا تو پنجۂ شاہیں میں کبوتر تھا

ندیم چشمِ فلک سے ٹپک رہے تھے نجوم
شبِ فراق بڑا اشک بار منظر تھا

جون ۱۹۸۰ء

○

ہونٹوں پہ تبسم لانے کو ہم کتنے خراب و خوار ہوئے
لیکن جو تبسم جمع کیے سب نذرِ امیدِ بہار ہوئے

برسوں کی خموشی نے ہم سے بدلہ بھی لیا تو بلا کا لیا
گفتار کی آزادی جو ملی، الفاظ ہی بے اظہار ہوئے

جشنِ انسان شماری میں سر گننے نکلے اہلِ حکم
مژدہ ہو کہ ان کی نصرت سے ہم بھی زندوں میں شمار ہوئے

اک چیخ بھی جو سر کر نہ سکے، محفوظ تھی ان کے دہن میں زباں
وہ سب ہی بریدہ زباں ہوں گے، گویا جو سرِ دربار ہوئے

ہر دور کے فن کاروں نے سدا، جو کام کیا، الٹا ہی کیا
مقبول تھا سنگ زنی کا چلن، یہ لوگ مگر گل بار ہوئے

اک قصرِ منقّش میں آخر ہم نے بھی ندیم قیام کیا
میدان بنے اس کے آنگن، کہسار اس کی دیوار ہوئے

جولائی ۱۹۸۰ء

○

کون کہتا ہے کہ تجھ سی کوئی صورت نہ ملی
ہاں مگر مجھ کو تری یاد سے مہلت نہ ملی

درد چمکا کہ مری روح میں سورج اُترا
عمر بھر راہِ وفا میں کہیں ظلمت نہ ملی

زندگی آج بھی بھرپور ہے ان کے دم سے
جن کو فرہاد کے انجام سے عبرت نہ ملی

مجھ کو اس شخص کے افلاس پہ رحم آتا ہے
جس کو ہر چیز ملی، صرف محبت نہ ملی

وہ بھی کیا علم — کہ جس سے تجھے — اے بحرِ علوم!
دل کی وسعت نہ ملی، غم کی دیانت نہ ملی

سرِ بازار کہیں جرم نہ ہو ہنسنا بھی
سرِ دربار تو رونے کی بھی رخصت نہ ملی

مار ڈالے گا اُسے جرم کا احساس ندیمؔ
قتل کر کے جسے، مقتول پہ سبقت نہ ملی

جولائی ۱۹۸۰ء

○

ہر سمتِ چمن ماتم ہُوا ہے
شجر سے ایک پتّا کم ہُوا ہے

اجل، تاریخِ انساں کا خلاصہ
یہی اک واقعہ پیہم ہُوا ہے

ابھی گزری تھی دل سے یاد اُس کی
کہ صحرا میں ہرن کا رم ہُوا ہے

نئی امید کیوں دل کو دلاؤں
بڑی مشکل سے مستحکم ہُوا ہے

ابھی "کُن" کہتے کہتے رہ گیا ہوں
محبت میں عجب عالم ہُوا ہے

ندیمؔ احباب نے جتنا کریدا
مرا غم اور بھی محکم ہُوا ہے

جولائی ۱۹۸۰ء

حیوانِ ناطق

میں اپنے لفظ کے دم سے جہاں میں اشرف ہوں
میں سوچتا ہوں تو لفظوں میں سوچتا ہوں، کہ میں
بغیرِ لفظ فقط تودۂ عناصر ہوں

زباں تو خیر سبھی کے دہن میں ہوتی ہے
وہ گُلدمیں ہوں کہ چڑیاں، وہ مور ہوں کہ چکور
وہ تیندوے ہوں کہ اژدر، وہ اسپ ہوں کہ شتر
وہ باز ہوں کہ کبوتر، شغال ہوں کہ غزال
مگر زباں کو وہ الفاظ سے سجاتے نہیں
وہ حرف و صوت کے رشتوں کو آزماتے نہیں

میں آج لفظ کا اک معجزہ دکھاؤں گا
بھڑک رہا ہے جو شعلہ سا، میرے باطن میں
اسے مَیں لفظ کی زنجیر میں کروں گا اسیر
زباں پہ لاؤں گا، عالم میں عام کر دوں گا

مگر یہ میری زباں ہے کہ سنگ ریزہ ہے!
صدا سے لفظ کا اعزاز کس نے چھین لیا!
ہزار لفظ سنور کر زباں پہ آتے ہیں
مگر لبوں کی حدوں سے گزر نہیں پاتے
تڑپ تڑپ کے وہیں ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں

یہ اور بات کہ میں عام جان دار نہیں
میں اپنے لفظ کے دم سے جہاں میں اشرف ہوں

جولائی ۱۹۸۰ء

○
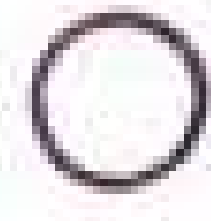
زہر کے بعد جو شرمندۂ تریاق ہوئے
آج وہ لوگ بھی منجملۂ عشاق ہوئے

زندگی بھر کوئی ہمراز نہ پایا ہوگا
درد کو سب سے چھپانے میں جو مشاق ہوئے

جو فرشتے تھے، وہ تا حشر فرشتے ہی رہے
اور جو خاک کے پیکر تھے، وہ خلّاق ہوئے

غوطہ زن حرف کبھی شعر نہ بننے پائے
لفظ جو سطح پہ تھے، زینتِ اوراق ہوئے

دور و نزدیک کا محور تھی مری ذات ندیم
دائرے میری نظر کے مرے آفاق ہوئے

جولائی ۲۰۰۸ء

○
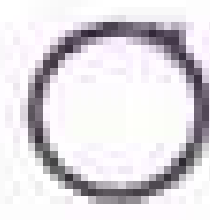
پیار کے دائرے کو تنگ کروں
یعنی اپنی اَنا سے جنگ کروں

جب مرا خون میرے کام نہ آئے
ریگِ صحرا کو رنگ رنگ کروں

آندھیوں میں چراغ لے کے چلوں
اور عناصر کو دنگ دنگ کروں

حمدِ ربِّ جمال ہے یہ بھی
ذکرِ حسنِ درونِ سنگ کروں

عشق کرتا ہے زہر خندِ ندیم
جب بھی احساسِ نام و ننگ کروں

جولائی ۱۹۸۰ء

○

زیست آزار ہوئی جاتی ہے
سانس تلوار ہوئی جاتی ہے

جسم بیکار ہوا جاتا ہے
روح بیدار ہوئی جاتی ہے

کان سے دل میں اترتی نہیں بات
اور گفتار ہوئی جاتی ہے

ڈھل کے نکھری ہے حقیقت جب سے
کچھ پُر اسرار ہوئی جاتی ہے

اب تو ہر زخم کی منہ بند کلی
لبِ اظہار ہوئی جاتی ہے

پھول ہی پھول ہیں ہر سمت ندیمؔ
راہ دشوار ہوئی جاتی ہے

جولائی ۸۰ء

○
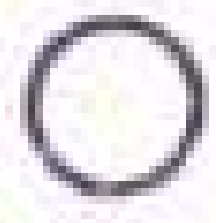
عشق میں ضبط کا یہ بھی کوئی پہلو ہوگا
جو مری آنکھ سے ٹپکا، ترا آنسو ہوگا،

ایک پل کو تری یاد آئے تو میں سوچتا ہوں
خواب کے دشت میں بھٹکا ہُوا آہُو ہوگا

تجھ کو محسوس کروں، مَس نہ مگر کر پاؤں
کیا خبر تھی کہ تو اک پیکرِ خوشبو ہوگا

اب سمٹتا ہے تو پھر مجھ کو ادھورا نہ سمیٹ
زیرِ سر سنگ نہ ہوگا، مرا بازو ہوگا

مجھ کو معلوم نہ تھی ہجر کی یہ رمز، کہ تو
جب مرے پاس نہ ہوگا تو بہر سُو ہوگا

اس توقع پہ میں اب حشر کے دن گِنتا ہُوں
حشر میں اور کوئی ہو کہ نہ ہو — تُو ہوگا

جولائی ۱۹۸۰ء

○
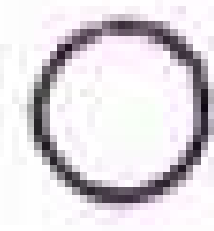
نہ جانے ترجماں ہیں کس قیامت کے اشاروں کی
دلِ افلاک میں اتری ہوئی نوکیں ستاروں کی

انا کی آندھیوں میں ٹوٹ جاتے ہیں شجر کتنے
نہیں ہوتی خبر دریاؤں کو، کٹتے کناروں کی

میں آنکھیں کھول کر کچھ دیکھنا چاہوں تو بے بس ہوں
کہ تاریخِ جہاں گردِ سفر ہے شہ سواروں کی

یہیں سے کاروانِ رنگ و بو اک روز گزرا تھا
چمن کے زرد پتّے یادگاریں ہیں بہاروں کی

میں راہِ زندگی میں جب بھی ٹھوکر کھا کے گرتا ہوں
بدل لیتی ہے تیور دوستداری میرے یاروں کی

محبّت میں تو غم بھی نفع ہے، دکھ بھی کمائی ہے
محبّت میں کبھی گنتی نہیں ہوتی خساروں کی

یہ نخلستان ہے تنہائیوں کے ریگزاروں کا
مرے اندر جو بستی بس رہی ہے میرے پیاروں کی

گریزاں ہے ابھی تک آدمی نورِ حقیقت سے
ابھی تک رسم ہے اربابِ فن میں استعاروں کی

اگر سچ بولنا چاہو تو شعروں میں بھی سچ بولو !
کہ اب اس عہد کو حاجت نہیں جادو نگاروں کی

زمیں پر حضرتِ انساں کی جوہر آفرینی سے
ندیمؔ اب آسماں کو بھی ضرورت ہے سہاروں کی

جولائی ۱۹۸۰ء

نطق و سماعت

ڈوبتے ڈوبتے، سورج نے اگر لب نہ ہلائے ہوتے
شبِ خاموش میں یہ گونج کہاں سے آتی!

میں نے پتھّر کو جو پتھر سے بجایا ہے
تو کہسار میں اک قہقہہ گونجا ہے — جیسے
جوشِ اظہار میں لفظوں کا دھماکا کہیے!

کچھ تو کوئل نے کہا ہے
کہ وہ کوکی ہے
تو دل میں کوئی شے ٹوٹی ہے!

کچھ تو کہتی ہے، سرِ شاخ، تڑپتی چڑیا
کہ وہ جب بولتی ہے
کائنات اپنے سمیٹے ہوئے پر تولتی ہے!

لوحِ خاک
۹۴

کرۂ خاک سے تا سبع سماوات

سبھی بولتے ہیں
اور سبھی سُنتے ہیں
ہاں، مگر نطق سے تا حدِ سماعت
جو مسافت ہے
مفاہیم کے پھولوں سے اَٹی رہتی ہے
اور لوگوں کو یہاں
رنگ سے رغبت ہے، نہ نکہت سے لگاؤ کوئی
وہ فقط بولتے ہیں
اور فقط سنتے ہیں

اگست ۱۹۸۰ء

ڈر

ہم بھی کیا لوگ ہیں
جو زیست سی نعمت کو بھی
ڈر ڈر کے بسر کرتے ہیں

ہم یہ کہتے ہیں
کہ جو پھول کِھلا ہے، اُسے مرجھانا ہے
لیکن اس پھول کو کھلنے کی تو کچھ داد ملے
اس کا یہ عزم تو دیکھو
کہ وہ اس علم کے باوصف کِھلا ہے
کہ بالآخر اسے مرجھانا ہے!

رنگ و بُو کا یہ صحیفہ ہے
اسے ڈر سے نہیں — چشمِ محبت سے پڑھو
اور ڈرنا ہی ضروری ہے
تو پھر مردنیِ حسِّ لطافت سے ڈرو!

اگست ۱۹۸۰ء

○
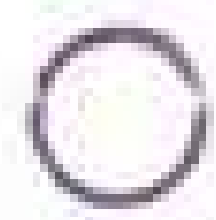
مرے سوال کا، یارب! کوئی جواب ملے
زمیں پہ کیوں مجھے اتنے فلک مآب ملے

یہ روزِ حشر ہے، لیکن مرے حساب سے قبل
مجھے خدا کی عنایات کا حساب ملے

وفورِ تشنہ لبی تھا کہ نقصِ دیدہ وری
مجھے تو جتنے سمندر ملے، سراب ملے

عظیم شہرِ حقیقت میں کتنا چھوٹا تھا
تمام قصر نشیں خانماں خراب ملے

کوئی بتا نہ سکا مجھ کو مدعائے حیات
جو گُل کھلا تو کئی راز بے حجاب ملے

نہ میں طلسم کا ماہر، نہ مجتہد، نہ رسول
مگر مجھے سفرِ شب میں آفتاب ملے

اگر نہیں ہے خدا کا کوئی شریک ندیمؔ
تو مجھ غریب کو بھی ہجر کا ثواب ملے

ستمبر ۱۹۸۰ء

○
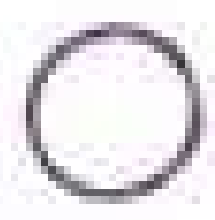
بگڑ کے مجھ سے، وہ میرے لیے اُداس بھی ہے
وہ زود رنج تو ہے، پر وفا شناس بھی ہے

تقاضے جسم کے اپنے ہیں، دل کا اپنا مزاج
وہ مجھ سے دور ہے اور میرے آس پاس بھی ہے

نہ جانے کون سے چشمے ہیں ماورائے بدن
کہ پا چکا ہوں جسے، مجھ کو اس کی پیاس بھی ہے

وہ ایک پیکرِ محسوس، پھر بھی نا محسوس
مرا یقین بھی ہے اور مرا قیاس بھی ہے

حسین بہت ہیں مگر میرا انتخاب ہے وہ
کہ اس کے حسن پہ باطن کا انعکاس بھی ہے

ندیمؔ اُسی کا کرم ہے، کہ اس کے در سے ملا
وہ ایک دردِ مسلسل جو مجھ کو راس بھی ہے

ستمبر ۱۹۸۰ء

○
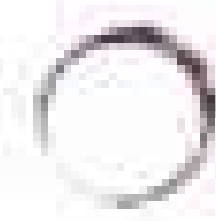
جانے کس سمت سے آیا ہوں کدھر جاتا ہوں
کوئی پوچھے تو یہ کہتا ہوں کہ گھر جاتا ہوں

یوں جو ظلمات سے دیوانہ گزر جاتا ہوں
برگِ گل خاک پہ گرتا ہے تو مر جاتا ہوں

یوں فرشتوں کو بھی خاطر میں نہ لاؤں لیکن
اپنا جب سامنا کرتا ہوں تو ڈر جاتا ہوں

ساری دنیا سے الگ ہے مرا استانا بھی
خار چبھتا ہے تو پل بھر کو ٹھہر جاتا ہوں

مجھ پہ تہمت ہے کہ میں کچھ بھی نہیں کر پاتا
چیخ کر، دشت کو سنسان تو کر جاتا ہوں

میں سمندر ہوں، جو کرتا نہیں توہینِ وفا
چاند کے ساتھ ہی، ساحل سے اُتر جاتا ہوں

پھول سا میرا مقدّر ہے، کہ میں بھی تو ندیم
صبح کھِلتا ہوں مگر شام بکھر جاتا ہوں

ستمبر ۱۹۸۰ء

○

مداوا حبس کا، ہونے لگا آہستہ آہستہ
چلی آتی ہے وہ موجِ صبا آہستہ آہستہ

ذرا وقفے سے نکلے گا، مگر نکلے گا چاند آخر
کہ سورج بھی تو مغرب میں چھپا آہستہ آہستہ

کوئی سنتا تو اک کہرام برپا تھا ہواؤں میں
شجر سے ایک پتّا جب گرا آہستہ آہستہ

تعجب میرے جل بجھنے پہ کیوں ہے میرے پیاروں کو
میں اپنی آنچ میں تپتا رہا آہستہ آہستہ

ابھی سے حرفِ رخصت کیوں جب آدھی رات باقی ہے
گل و شبنم تو ہوتے ہیں جدا آہستہ آہستہ

مجھے منظور، گر ترکِ تعلّق ہے رضا تیری
مگر ٹوٹے گا رشتہ درد کا آہستہ آہستہ

غرورِ مدّعا، شرمندۂ اظہار کیوں ہوتا
ہیں اشکوں ہی میں سب کچھ کہہ گیا آہستہ آہستہ

پھر اس کے بعد شب ہے جس کی حد صبحِ ابد تک ہے
مغنّی! شام کا نغمہ سنا آہستہ آہستہ

شبِ فرقت میں جب نجمِ سحر بھی ڈوب جاتا ہے
اُترتا ہے مرے دل میں خدا آہستہ آہستہ

میں شہرِ دل سے نکلا ہوں سب آوازوں کو دفنا کر
ندیمؔ اب کون دیتا ہے صدا آہستہ آہستہ

اگست ۱۹۸۰ء

○
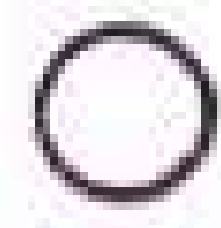
ہم جو بند ھے ہیں، کوئی سُن رہا نہ ہو
یعنی کہیں قریب ہمارا خدا نہ ہو

اے پاسِ وضع کے نفسِ سرد! دیکھنا
میرا چراغِ ضبطِ فغاں بجھ گیا نہ ہو

میں سُن رہا ہوں کب سے ترے دل کی دھڑکنیں
لیکن یہ رخشِ وقت کی آوازِ پا نہ ہو

شبنم کے انتظار میں مرجھا کے جو گرا
وہ برگِ گُل کہیں مرا دستِ دعا نہ ہو

دکھ ہے تو صرف یہ کہ وہ دکھ دے کے خوش ہُوا
ورنہ کسی بھی دکھ سے مجھے دُکھ ذرا نہ ہُوا

وہ غم ہی کیا، جو غم کا مداوا نہ کر سکے
وہ دل ہی کیا، جو راکھ تو ہو، کیمیا نہ ہو

کوئی سبب تو ہو مرے باطن کے نور کا
آنسو ہی دل میں بن کے ستارہ، گرا نہ ہو

آیندہ کا سفر ہے، مگر ہر قدم یہ فکر
ماضی کا نقشِ پا ہی مرے زیرِ پا نہ ہو

آواز کفر ہے، تو کچھ ایسا ہو اہتمام
ٹوٹے گر آسماں بھی، تو کوئی صدا نہ ہو

انعام پا رہا ہوں میں خود اپنے قتل کا
یا رب، اس امتحاں میں کوئی مبتلا نہ ہو

تہذیب کا یہ کتنا مہذّب اصول ہے
پردے میں چاہے کچھ ہو، مگر برملا نہ ہو

اک عمر سے ہے مجھ کو اس انسان کی تلاش
اچھا جو مجھ سے بڑھ کے ہو، مجھ سے بُرا نہ ہو

گر وہ مری دعا ہے، تو پوری بھی ہو ندیم
گر وہ مرا خدا ہے، تو پھر نارسا نہ ہو

اگست
۱۹۸۰ء

○
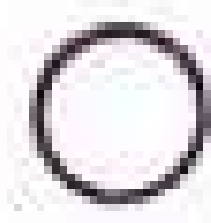
کچھ گھبرایا گھبرایا سا لگتا ہوں
ابھی ابھی زندانِ ذات سے نکلا ہوں

روزِ قیامت ہے میرا ہر روزِ حیات
حشر ہوں اور خود اپنے اندر برپا ہوں

زندگی کرنے کا فن خود سیکھا ہی نہیں
اور سارے الزام خدا پر دھرتا ہوں

جس نے پیاس بجھانی چاہی پیاسوں کی
اب صحرا میں غائب ہوتا دریا ہوں

ایک دیا ہوں، جس نے جل کے سحر کر دی
اب سورج کے حوالے، اب میں جلتا ہوں

تیرے ساتھ چلوں، گر تیری اجازت ہو
قافلۂ گل! میں جو خزاں کا پتا ہوں

دھرتی پہ کچھ دیر تو مجھ کو رُکنے دو!
کڑے سفر کے بعد یہاں تک پہنچا ہوں

میں جو گراں ہوں زر کے ہزار انباروں سے
پھول کی پتی سامنے ہو تو سستا ہوں

میرا کمالِ فن ہے امکانات کی سیر
ریت پہ بیٹھا پھول بناتا رہتا ہوں

کوئی شجر ہی نہیں ہے جس سے کلام کروں
حبس کے ویرانوں میں بھٹکتا جھونکا ہوں

میں — میرے نقاد — بہت ہی بُرا سہی
اتنا بُرا نہیں ہوں جتنا اچھا ہوں

رات کو روشن رکھنا میرا کام ندیم
شام کا پہلا، صبح کا آخری تارا ہوں

اپنے لہو سے آپ چراغاں کرتا ہوں
مجھ کو بھی دیکھو، میں بھی تو ایک تماشا ہوں

میرے عدوئے تیرہ ضمیر کو کیا معلوم
نورِ سحر ہوں، اور افق پر ملتا ہوں

دشتِ خیال کا ایک بگولا ہوں لیکن
عرش کو چھوتا ہوں جب فرش سے اُٹھتا ہوں

میری حیات، تلاشِ جنّتِ گم گشتہ
اوّل دن سے اپنے وطن سے بچھڑا ہوں

باندھ رکھا ہے میں نے ازل سے رختِ سفر
کھول کے شہپرِ فکر، ابد تک اُڑتا ہوں

ایک آوازہ مسلسل پیچھا کرتی ہے
— انسانو! میں باغِ بہشت میں تنہا ہوں —

میں انسان ہوں، میرا غروب قیامت ہے
میں سورج ہوں اور نقطۂ ہر ڈوبا ہوں

گزرے دنوں کی گونج بھی میرے کان میں ہے
آنے والے دور کی چاپ بھی سنتا ہوں

پاس رہے جس کو آداب عداوت کا
میں دیوانہ اُس دشمن پر مرتا ہوں

شاید مستقبل کا مؤرخ ہی سُن لے
پتھّر کی دیوار پہ دستک دیتا ہوں

شعر کہے تو کبھی کبھی محسوس ہُوا
جیسے ابر ہوں اور خلا میں برسا ہوں

اپنی فنا سے مجھ کو بلا کی ضد ہے ندیمؔ
سبزہ بن کر اپنی لحد سے نکلا ہوں

اگست ۱۹۸۰ء

○

دکھ سب کو خود اپنی ذات کا ہے
انجام یہی حیات کا ہے

ہر شخص کے کہہ رہے ہیں تیور
مرکز وہی کائنات کا ہے

مجبور نہیں خدا، مگر کیوں
جو کچھ ہے، ہدف ممات کا ہے

اک سانس پہ دسترس نہیں ہے
اور خواب وہی ثبات کا ہے

دنیا کو بنا لیا ہے دشمن
جھگڑا فقط التفات کا ہے

محکومیِ خیر و شر کو تج دے
یہ راستہ ہی نجات کا ہے

مشرق سے نکل رہا ہے سورج
یہ سارا کمال رات کا ہے

قدرت کی کبھی اک جہت نہیں ہے
یہ کھیل ہی شش جہات کا ہے

تنکا ہے ندیم — زندگانی
اور سیل تغیّرات کا ہے

اگست ۱۹۸۰ء

خرید و فروخت

وہ مجھے بیچنے نکلا ہے
مگر کون خریدے گا مجھے!

وہ مری غیرت و معیارِ حمیّت کو کہاں بیچے گا!
یہ وہ اجناس ہیں جن کی کوئی قیمت ہی نہیں
اور قیمت کوئی دینے کو جو تیار ہو

وہ پوری زمیں
اور ستارے جو زمیں سے نظر آتے ہیں
کہاں سے دے گا؟

وہ مجھے بیچنے نکلا ہے
مگر میرا ضمیر اتنا گراں ہے
کہ مجھے کوئی خریدے گا تو بک جائے گا
اور بک کر بھی مرے دام نہ دے پائے گا

وہ مجھے بیچنے نکلا ہے، مگر
میرے آقا کو اگر
فرش سے تا عرش کی ہر چیز تھما دے مرا گاہک
تو تھما دے — لیکن
مجھ میں وہ آگ ہے
جو بڑھتا ہوا ہاتھ بھسم کر دے گی
صرف اک چیز ہی قیمت مری کم کر دے گی
بے ضمیری — کہ جو ہستی کو عدم کر دے گی

ستمبر ۱۹۸۰ء

کیا اسیری ہے کیا رہائی ہے!

نظریں مری، مرتسم افق پر
اور بیٹھا فصیلِ سنگ کے ساتھ
تا حدِ نظر، افق افق تک
پھیلا ہُوا دشتِ بے اماں ہے
اور ایسے ہجوم سے اٹا ہے
جو سُوئے فصیل بڑھ رہا ہے
ہر شخص کے ہاتھ میں زباں ہے
چابک کی طرح جو چل رہی ہے
ہر شخص کی روح باہر آکر
اور جسم کا تھام کر لبادہ
بچے کی طرح مچل رہی ہے
آنکھوں سے شرار گر رہے ہیں
ملبوس میں آگ جل رہی ہے
القصہ، بہت عجب سماں ہے

لوحِ خلائے

۱۱۴

بپھرا ہُوا یہ ہجوم سارا
دشمن سے مجھے رہا کرانے
لے کر مرا نام ، یوں پکارا
جس طرح پہاڑ گونجتے ہوں
یا گرتا ہو آبشار دھارا
قیدی کو نوید مل رہی ہے
اب دیکھ رہا ہوں یہ نظارا
پتھر کی فصیل ہل رہی ہے
اور میں ، جو اسیر تھا بچارہ
ملبے میں کچل کر اور دب کر
ملبے کی طرح بکھر گیا ہوں
اے ہمنفسانِ درد ! مجھ کو
کچھ میرا سراغ دو ، خدارا !

ستمبر ۱۹۸۰ء

○

بے شمار انساں ہیں، سب کا سراپا ایک ہے
سب کے خال و خد جدا ہیں، اور چہرہ ایک ہے

بے حساب اسلوب ہیں اظہارِ مطلب کے، مگر
آنکھ سے گرتے ہوئے اشکوں کا لہجہ ایک ہے

آخری سچائی کی منزل ہے سب کے سامنے
سب کی راہیں مختلف ہیں، سب کا جذبہ ایک ہے

میں نے ماضی اور مستقبل کی صدیاں چھان لیں
میں نے دیکھا — وقت کے کیسے میں لمحہ ایک ہے

عدل کر، اولادِ آدم کے مقدّر! عدل کر
تشنہ لب لاکھوں کروڑوں، اور دریا ایک ہے

وسعتِ عالم میں مانندِ لحد ابھرا ہوا
جستجو کے بحرِ ظلمت میں جزیرہ ایک ہے

سب کے سب فانی ہیں، باقی ہے فقط ذاتِ خدا
قاتل و مقتول کی قبروں پہ کتبہ ایک ہے

پیار سے قائم ہے تخلیقِ دو عالم کا بھرم
اس شجر کی اَن گنت شاخیں ہیں، بیتا ایک ہے

جتنے چہرے ہیں وہ اک چہرے کا عکس و نقش ہیں
یوں تو رشتے سیکڑوں ہیں، اصل رشتہ ایک ہے

کیا بتاؤں، کون سی تخصیص مجھ کو بھی گئی
یوں تو اپنے ہیں سب انساں، میرا اپنا ایک ہے

کتنی وحدت ہے صداؤں کے تنوع میں ندیمؔ
ساز سب کے اپنے اپنے، سب کا نغمہ ایک ہے

ستمبر ۱۹۸۰ء

○
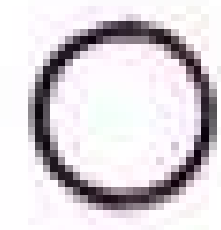
اِن زمینوں میں شجر کاریِ نو ہے درکار
سبز ہوتے نہیں اکھڑے ہُوئے پودے زنہار

فصلِ گل آئے تو بٹ جائے توجہ شاید
مجھ سے ہوتا نہیں سوکھے ہُوئے پتّوں کا شمار

کوئی منزل نہ کوئی سمت معیّن اپنی
ہم ہیں بے ربط کہانی کے ادھورے کردار

اب زبردست کو یلغار کی حاجت ہی نہیں
اب تو نیلام پہ چڑھ جاتا ہے قوموں کا وقار

رخ پہ برنائی بھی ہو، چال میں رعنائی بھی ہو
صرف مخلوقِ خدا سے نہیں سجتے بازار

اب تو مہرِ لبِ اظہار، خدارا، توڑ دو
مجھ کو اس وقت فقط اذنِ فغاں ہے درکار

اب تو وا جب ہُوا خورشیدِ قیامت کا طلوع
چار جانب ہے گھٹا ٹوپ اندھیرے کا حصار

قدغنوں پر سے اُچھل جاتا ہے سیلِ تاریخ
اور فلک تک تو کبھی اُٹھ نہیں سکتی دیوار

تیز زن آج تو وہ شخص بھی کہلائے ندیمؔ
شیر کی جگہ جو کرتا رہے چڑیوں کا شکار

اکتوبر ۱۹۸۰ء

○
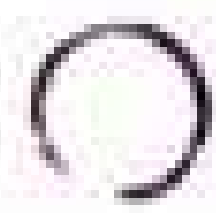
کتنے طلسم عشق کی نادانیوں میں تھے
گل سے لبوں میں، چاند سے پیشانیوں میں تھے

ڈرتے تھے چاند سے بھی، ہراساں تھے گل سے بھی
جو لوگ اپنی ذات کے زندانیوں میں تھے

ساحل پہ شب زمیں کا فلک سے وصال تھا
اُترے ہوئے نجوم، رواں پانیوں میں تھے

ہر فکر کا مآل، جوازِ گناہ تھا
جتنے ثواب تھے، مری حیرانیوں میں تھے

دیمک تنے کو چاٹتی جاتی تھی، اور ہم
کتنے مگن شجر کی نگہبانیوں میں تھے

پھرے تو اہلِ شہر کے تھے پُرسکوں مگر
ڈوبے ہُوئے ضمیر پشیمانیوں میں تھے

یوسف کا اِک لقب مہِ کنعاں تو تھا، مگر
یوسف کے بھائی بھی انہی کنعانیوں میں تھے

پھولوں میں تیغِ پتھروں کو لپیٹے ہُوئے ندیم
مصروف یار لوگ گُل افشانیوں میں تھے

اکتوبر ۱۹۸۰ء

نوحہ

اطہر نفیس٭ کی یاد میں

ہم آج خود سے بچھڑنے لگے ہیں تیرے بعد
تو چل بسا ہے کہ ہم مر گئے ہیں تیرے بعد

دلوں کو آبِ روانِ وفا کہاں سے ملے
محبتوں کے چمن جل بجھے ہیں تیرے بعد

ہر ایک شاخ صلیبِ بہار لگتی ہے
شجر شجر سے وہ پتّے گرے ہیں تیرے بعد

تو کیا گیا کہ وہ معیارِ رنگ و بو بھی گیا
دہانِ زخم ہیں، جو گل کھلے ہیں تیرے بعد

جدھر نگاہ اُٹھے، کچھ نظر نہیں آتا
کہ کائنات میں آنسو بھرے ہیں تیرے بعد

تری جہت ہی چنی شش جہات میں ہم نے
تری طرف ہی قدم اُٹھ رہے ہیں تیرے بعد

رہِ سفر، کہ جو باقی ہے، کون کاٹے گا
دیے حیات نے گُل کر دیے ہیں تیرے بعد

٭ وفات: ۲۱ر نومبر ۱۹۸۰ء
۲۱ر نومبر ۱۹۸۰ء (شب)

○
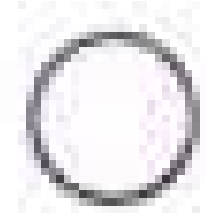
یہ غم نہیں، کوئی پتھر ادھر بھی آئے گا
کہ اس کے بعد مرا شیشہ گر بھی آئے گا

میں اس یقیں سے ٹھٹھرتا ہوں شب کے سائے تلے
اسی شجر پہ سحر کا ثمر بھی آئے گا

میں عمر بھر درِ دل وا رکھوں گا اس کے لیے
کہ وہ خدا ہے تو پھر اپنے گھر بھی آئے گا

یہ سوچ کر میں الجھتا ہوں آسمانوں سے
کہ ٹوٹ کر کوئی تارا ادھر بھی آئے گا

ندیمؔ درد سے دل ہی نہیں ہرے ہوں گے
ہنروروں کو غزل کا ہنر بھی آئے گا

دسمبر ۱۹۸۰ء

نقصِ بصارت

معالج نے یہ کل مجھ کو بتایا:
تری بینائی میں فرق آگیا ہے
تری ضد نے تجھے یہ دن دکھایا

اگر کچھ ڈر ہے تجھ کو اندھے پن سے
تو سورج کو نہ دیکھا کر، دگرنہ
چٹخ جائیں گے یہ آئینے، چھن سے!

حقیقت کا نظارا کر رہا ہوں
مگر میرے معالج کو گلہ ہے
میں سورج کو مسلسل دیکھتا ہوں

جنوری ١٩٨١ء

○
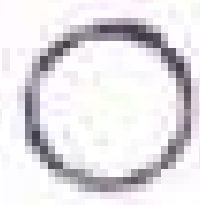
دل میں اب درد مچلتا ہی نہیں
اک دیا تھا، سو وہ جلتا ہی نہیں

زہرِ تنہائی کا تریاق ہے چاند
اور وہ بادل سے نکلتا ہی نہیں

یوں تو چھتنار ہے نخلِ امید
پھولنا خوب ہے، پھلتا ہی نہیں

مجھ کو قسّامِ ازل نے بخشا
وہ مقدّر، جو بدلتا ہی نہیں

جی لیے بھی - مر لیے بھی دیکھا ہم نے
دل کسی طور بہلتا ہی نہیں

شام ہر دن کو نگل جاتی ہے
اک یہ لمحہ ہے جو ڈھلتا ہی نہیں

اس پہ شاہد ہے مری عمر ندیم
وقت اُڑتا بھی ہے، چلتا ہی نہیں

جنوری، ۱۹۰۱ء

○

میری پہچان نمازیں ہیں نہ تکبیریں ہیں
آج کل میرا تعارف مری تقصیریں ہیں

آنکھ کھلتے ہی اُجڑ جاتے ہیں منظر سارے
خواب لاکھوں ہیں، مگر ایک سی تعبیریں ہیں

پڑھنے والو! کوئی مفہوم تو ہو گا ان کا
صفحۂ ابر پہ کوندوں کی جو تحریریں ہیں

ہم پذیرائی پہ مامور ہیں، اے خواجۂ شہر!
ہاتھ میں پھول ہیں اور پاؤں میں زنجیریں ہیں

سب خد و خال خدا کے ہیں مصوّر جیسے
یہ جو انسان نظر آتے ہیں، تصویریں ہیں

فروری ۱۹۸۱ء

○
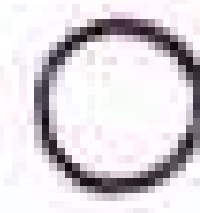
کچھ نہ تھا زیست کے صحرائے بلا سے آگے
پھر وہی دشت ملا، حدِ فنا سے آگے

نارسائی ہی دعاؤں کا مقدر ہے اگر
میں نکلنے کو ہوں اب اپنی صدا سے آگے

اس کے دامن میں فقط اس کی انا ہوتی ہے
ہاتھ رہتا ہو سدا جس کا، عطا سے آگے

یوں خلاؤں کے تجسس میں ہوں غلطاں جیسے
اک زمیں اور بھی ہو ماہ و سہا سے آگے

مجھ کو امکان کے روزن سے نظر آتے ہیں
نت نئے ارض و سما ارض و سما سے آگے

یہ کسی بھولی ہوئی یاد کی ہے رمز نسیم
اک ہیولیٰ سا ہے کیا، موجِ صبا سے آگے

فروری ۱۹۸۱ء

ایک تالاب کی کہانی

آج دفتر کو جاتے ہوئے
ایک بچے کو دیکھا
کہ تختی کو بستہ بنائے کھڑا تھا
مجھے دیکھتے ہی وہ بولا:
"چلو، گیند پھینکو!"

شہنشاہِ معصومیت کے یہ احکام جب میں بجا لا چکا
تو یکایک میں بچپن کے ماحول میں تھا
مرے ہاتھ میں میری تختی تھی
اور سر پہ بستہ تھا
اور میری صحت بلا کی تھی
میں ہر قدم پر خود اپنے ہی گالوں کو ہلتا ہوا دیکھتا تھا!

ابھی وقت باقی تھا

اور میں خراماں خراماں چلا جا رہا تھا

مرے مدرسے اور مجھ میں فقط ایک تالاب کا فاصلہ تھا

یہ تالاب کل تک تو بارش کے پانی سے لبریز تھا

آج لیکن نہ پنہاریاں گاگریں بھر رہی تھیں

نہ مرغابیاں تیرتی تھیں

فقط ایک شیشہ سا مشرق سے مغرب تلک جگمگاتا تھا

اور ایک دھندلائے سورج کو کتنی ہی موہوم قاشوں میں بانٹے،

زمیں پر بچھا تھا

میں کچھ سہما سہما سا، کچھ دم بخود سا کھڑا تھا

کہ استاد جی، مدرسے جاتے جاتے، مرے پاس ٹھہرے

بڑے پیار سے، مجھ سے کہنے لگے:

"تم نے تالاب کا حال دیکھا؟

گئی رات شدت کی سردی پڑی تھی

سو تالاب کی سطح نے منجمد ہو کے، تالاب کی ساری صورت

بدل دی

ابھی دھوپ جب تیز ہوگی
تو تالاب کی سطح چٹخے گی
پھر برف کی چادریں سی، یہاں سے وہاں، تیرتی اور پگھلتی ہوئی
آخرِ کار، پانی میں گھل جائیں گی
اور تالاب نیچے سے اُوپر اُبھر آئے گا!"

مجھ کو پانی پہ رحم آگیا
ٹھنڈ سے کانپنے کانپنے اس کا کیا حال ہوگا!
اسے برف کے قید خانے سے کیسے رہائی دلاؤں!
اسے دھوپ میں لا کے کیسے بٹھاؤں!
یکایک مجھے ہاتھ میں اپنی تختی نظر آگئی
میں نے یخ سطح پر کھینچ کر اس کو مارا
تو برف ایک دم ٹھیکری ٹھیکری ہوگئی
اور نیچے سے پانی نے اک قہقہہ مار کر مجھ سے آنکھیں ملائیں
تو جیسے مجھے دو جہاں کی خوشی گھڑیوں گھڑیوں مل گئی!

اب میں دفتر کو جاتا ہوں

اور اپنی عینک لگی آنکھ سے دیکھتا ہوں
کہ چاروں طرف سطح پر برف چھائی ہوئی ہے
کہ میرے ہاتھوں میں تختی نہیں ہے
اُسے میرا علم، اور عمر، اور کتنے کڑے تجربے چھپا کر لے گئے ہیں
میں محبوس پانی کی حالت پہ کڑھتا ہوں
اور صرف کڑھتا ہوں
اور صرف کڑھنے سے سورج چمکتے نہیں
اور برفیں پگھلتی نہیں ہیں!

فروری ۱۹۸۱ء

○
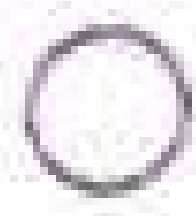
لچک سی جیسے لپکتی ہوئی صدا میں پڑے
ترا خرام جو دیکھا تو بل ہوا میں پڑے

جو دن تھا، حشر کا دن تھا — جو شب تھی، حشر کی شب
عجیب طرح کے جنگل رہِ وفا میں پڑے

خدا کو گونج کا انداز کتنا پیارا ہے
مری دعا ہی مرے دامنِ دعا میں پڑے

جو مشتِ خاک تھی تپ کر بھی مشتِ خاک رہی
مجھے زمانہ ہوا علمِ کیمیا میں پڑے

میں ایک بار تو خود اپنے کام آؤں فہیم
مرے مزاج کا سونا مری دوا میں پڑے

فروری ۱۹۸۱ء

تیرانداز

جو بھی آتا ہے، سمجھتا ہے کہ وہ تیر ہے

چٹکی سے جو نکلے تو چٹانوں کے جگر شق کردے

وہ نہیں جانتا

تاریخ بڑی ظالم ہے

وہ تو ہر تیر کو اس طرح سے کج کرتی ہے

کہ اگر وقت پڑے، تیر چلے

تو وہ قوسیں سی بناتا ہُوا، بڑھتا ہے

مگر بڑھ کے کچھ اس طرح پلٹتا ہے

کہ خود تیر چلانے والا

آخرِ کار ہدف بنتا ہے!

فروری ۱۹۸۱ء

○

زندگی غیر کی سوغات نہ ہو
رزق آلودۂ خیرات نہ ہو

کائناتوں کے تناظر میں زمیں
کہیں منجملۂ ذرّات نہ ہو

جبکہ سب کچھ ہے مرے ہونے سے
کیوں مری ذات کا اثبات نہ ہو

روزِ روشن سے جو آنچ آتی ہے
یہ کہیں جلتی ہوئی رات نہ ہو

میں عناصر سے دعا مانگتا ہوں
چھت ٹپکتی ہو تو برسات نہ ہو

آئنہ دیکھ کے مجھ کو، بولا
کوئی واماندۂ حالات نہ ہو

اب تو یہ غایتِ فن ٹھہری ہے
شعر شرمندۂ جذبات نہ ہو

لب ترستے ہیں تبسم کو ندیم
ضبطِ غم کی یہ مکافات نہ ہو

فروری ۱۹۸۱ء

سمے کا جادو

ابر کو جس قدر برسنا تھا
دھیرے دھیرے برس کے چھٹنے لگا
صبح کے زرنگار چہرے سے
بادلوں کا حجاب ہٹنے لگا

بھیگی بھیگی منڈیر پر، چڑیاں
ایک لمبی قطار میں بیٹھی،
دھوپ میں پر سنوارنے کے لیے
پھڑپھڑانے لگیں، نکھرنے لگیں
پتّیاں، پھول سے جدا ہو کر
ڈولتے ڈولتے سنبھلتی ہوئی
تازہ تازہ نہائے سبزے پر
موتیوں کی طرح بکھرنے لگیں

قوس میں اُڑتی ڈار کونجوں کی
نور کی جستجو میں سرگرداں
بدلیوں کے قریب، سورج سے
روشنی پا کے، جگمگانے لگی
کیسا بالیدگی کا منظر ہے!
میری آنکھوں میں ڈبڈبائی نمی
دل کے سنسان ریگ زاروں میں
یاد کا پیڑ سا اُگانے لگی

میرے ماضی کے لمحے لمحے کا
جتنا پھیلاؤ تھا، سمٹنے لگا
حرف ڈوبے ہُوئے اُبھرنے لگے
وقت جاتا ہُوا، پلٹنے لگا

مارچ ۱۹۸۱ء

○

دستگیری کر، اے زبانِ جمال
آج مطلوب ہے بیانِ جمال

اور کس کا ہے یہ طلسمِ خرام
نقشِ پا سے ملا نشانِ جمال

قریہ قریہ بھٹکتا پھرتا ہوں
تیرا پیکر ہے اک جہانِ جمال

ڈھونڈتی ہیں کسے تری آنکھیں
اُڑتے پھرتے ہیں طائرانِ جمال

تیرا اقبالِ حسن اور بڑھے
اک تبسم سے لیا زبانِ جمال

اب تو ہر سانس میں ہے گونج تری
اب تو شب پر بھی ہے گمانِ جمال

گل سے جب برگِ گل بچھڑ کے گرے
ٹوٹ پڑتا ہے آسمانِ جمال

خشک لب میرے، چھلنی پاؤں مرے
اور غضب ہے، مزاجدانِ جمال

ہے مدے قیسِ دشتِ ہفت افلاک
اور زمیں نافہ زرانِ جمال

بخش دے گا مجھے خدائے جمیل
میں کہ ہوں ایک مدح خوانِ جمال

شعر کہنا شعاعیں چننا ہے
شاعری، نورِ جاودانِ جمال

مارچ ۱۹۸۱ء

○

انساں ابھی شہپارۂ ارژنگ نہیں ہے
چہرے پہ سبھی کچھ ہے، مگر رنگ نہیں ہے

جنّت کے سفر میں جو نہ حائل ہوں تو بہتر
فطرت کے عناصر سے مری جنگ نہیں ہے

احساسِ جمال اس کو کبھی ہو نہیں سکتا
شیشے کے مقدر میں اگر سنگ نہیں ہے

انجامِ محبت کی مسافت کا نہ ڈھونڈو
اتنا بھی تو صحرائے زمیں تنگ نہیں ہے

اک در ہے اگر بند تو بستی میں ہیں سو در
اے دستِ سخا، پائے گدا لنگ نہیں ہے

مارچ ۱۹۸۱ء

○
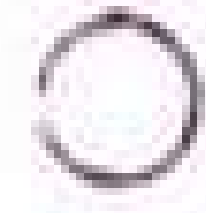
بھرم غزال کا جس طرح رم کے ساتھ رہا
مرا ضمیر بھی میرے قلم کے ساتھ رہا

ہدایتوں کے سفر سرخوشی میں گزرے ہیں
کہ اس کا عکس مری چشمِ نم کے ساتھ رہا

اِک آفتاب مرے سر سے ڈھل سکا نہ کبھی
کہ میرا سایہ مرے ہر قدم کے ساتھ رہا

نہ بھول پائے وطن کو، جلا وطن جیسے
ہر آدمی کا تعلق ارم کے ساتھ رہا

دعا کو ہاتھ اٹھانے سے خوف آتا ہے
کہ جبرِ برق بھی ابرِ کرم کے ساتھ رہا

گواہ ہے مرا اسلوبِ جاں کنی، کہ ندیم
مرا غرورِ ہنر میرے دم کے ساتھ رہا

مارچ ۱۹۸۱ء

○
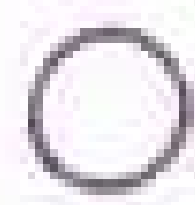
عرش سے سچ کی ہدایت بارہا ملتی رہی
ہم جو سچ بولے تو کیوں اس کی سزا ملتی رہی

رزق کی خاطر زمیں کھودی مگر پتھر ملے
اور ادھر پتھر میں کیڑے کو غذا ملتی رہی

ہم تو اس کو بھی مشیت کی سخاوت ہی کہیں
زندگی بھر سانس لینے کو ہوا ملتی رہی

ایک پل بھی زندہ رہنا اک قیامت تھا ندیمؔ
اور طولِ عمر کی ہم کو دعا ملتی رہی

مارچ ۱۹۸۱ء

○

کسی لاعلاج رجائی نے یہ خبر چمن میں اڑائی ہے
کوئی پتّا جب نہ ہو شاخ پر تو سمجھ لو، فصلِ گل آئی ہے

کوئی اشتراک ضرور ہے، وہ ہو رنگ کا کہ امنگ کا
مرا دل بھی تو گلِ سرخ ہے، ترا ہاتھ بھی تو حنائی ہے

وہ کشش کچھ اور ہی چیز ہے جسے حسن کہتے ہیں اہلِ دل
نہ جمالِ عارض و چشم و لب، نہ کمالِ چست قبائی ہے

سفرِ حیات کے موڑ پر، مجھے تُو ملا کہ خدا ملا
یہی میرا کعبۂ جستجو، یہی میری حدِ رسائی ہے

میں جھکوں تو چرخ جھکا رہے، میں رُکوں تو وقت رُکا رہے
میں تری وفا کا جب اہل ہوں، مرے بس میں ساری خدائی ہے

میں ندیمِ قریۂ سیم و زر سے بھی سرکشیدہ گزر گیا
جو مری انا کا غرور ہے، مری عمر بھر کی کمائی ہے

اپریل ۱۹۸۱ء

○
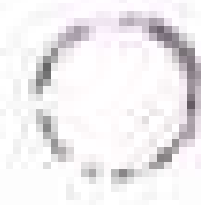
کام ہی کیا ہے مسافر کو، گزرنے کے سوا
سبھی آرام میسّر ہیں، ٹھہرنے کے سوا

لہر اٹھتی ہے نہ دریا میں بھنور پڑتے ہیں
کوئی چارہ نہ رہا پار اُترنے کے سوا

کاش واعظ نے محبت بھی سکھائی ہوتی
اور کیا کیجیے اللہ سے ڈرنے کے سوا

حسن کا فرض ہُوا کرتی ہے آرائشِ حسن
صبح کیا کرتی ہے ہر روز سنورنے کے سوا

عمر گزری ہے اُس انساں کے تجسّس میں ندیمؔ
اور بھی کام جو کر لیتا ہو مرنے کے سوا

اپریل ۱۹۸۱ء

○
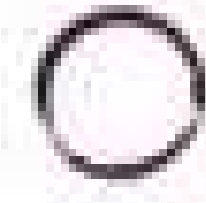
اک محبت کے عوض، ارض و سما دے دوں گا
تجھ سے کافر کو تو میں اپنا خدا دے دوں گا

جستجو بھی مرا فن ہے، مرے بچھڑے ہوئے دوست!
جو بھی در بند ملا، اُس پہ صدا دے دوں گا

ایک پل بھی ترے پہلو میں جو مل جائے، تو مَیں
اپنے اشکوں سے اسے آبِ بقا دے دوں گا

تو کرم کر نہیں سکتا تو ستم توڑ کے دیکھ
میں ترے ظلم کو بھی حسنِ ادا دے دوں گا

رُخ بدل دوں گا صبا کا، ترے کوچے کی طرف
اور طوفان کو اپنا ہی پتہ دے دوں گا

جب بھی آئیں مرے ہاتھوں میں رُتوں کی باگیں
برف کو دھوپ، تو صحرا کو گھٹا دے دوں گا

مئی ۱۹۸۱ء

○

خزاں نصیب ہیں، رشتہ مگر بہار سے بھی
مجھے توکّل کی توقّع ہے نوکِ خار سے بھی

مُصِر ہوں میں کہ گِنا جاؤں باوقاروں میں
انھیں یہ ضد کہ میں خارج رہوں شمار سے بھی

کہاں بھی جاؤں، اسیرِ حیات رہتا ہوں
یہ مسئلہ تو نہ حل ہو سکا فرار سے بھی

سحر کی کتنی دعائیں خدا سے مانگی ہیں
اب التماس کروں گا جمالِ یار سے بھی

عجیب حشرِ محبت کا سامنا ہے، کہ وہ
خفا خفا ہے، مگر دیکھتا ہے پیار سے بھی

میں مر بھی جاؤں تو تخلیق سے نہ باز آؤں
بنیں گے نت نئے خاکے مرے غبار سے بھی

ندیمؔ وقت کا مرہم نہ میرے کام آیا
کہ زخمِ دل نہ بھرا طولِ انتظار سے بھی

مئی ۱۹۸۰ء

○
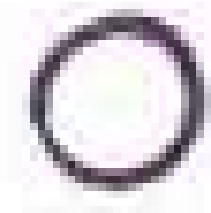
تیری گفتار میں تو پیار کے تیور کم تھے
کبھی جھانکا تری آنکھوں میں تو ہم ہی ہم تھے

لمس کے دم سے بصارت بھی، بصیرت بھی ملی
چھو کے دیکھا تو جو پتھر تھے، ترے ریشم تھے

تیری یادیں کبھی ہنستی تھیں، کبھی روتی تھیں
میرے گھر کے یہی ہیرے تھے، یہی نیلم تھے

برف گرماتی رہی، دھوپ اماں دیتی رہی
دل کی نگری میں جو موسم تھے، ترے موسم تھے

میری پونجی مرے اپنے ہی لہو کی تھی کشید
زندگی بھر کی کمائی مرے اپنے غم تھے

آنسوؤں نے عجب انداز میں سیراب کیا
کہیں بھیگے ہوئے دامن، کہیں باطن نم تھے

جن کے دامن کی ہوا میرے چراغوں پہ چلی،
وہ کوئی اور کہاں تھے، وہ مرے ہمدم تھے

میں نے پایا تھا بس اتنا ہی حقیقت کا سراغ
دو زنک پھیلنے خاک کے تھے، مگر مبہم تھے

میں نے گرنے نہ دیا، مر کے بھی، معیارِ وقار
ڈوبتے وقت مرے ہاتھ، مرے پرچم تھے

میں سرِ عرش بھی پہنچا تو سرِ فرش رہا
کائناتوں کے سب امکاں مرے اندر ضم تھے

عمر بھر خاک میں جو اشک ہوئے جذب ندیم
برگِ گل پر کبھی ٹپکے تو وہی شبنم تھے

جولائی ۱۹۸۱ء

دَورِ جوہر

برفاب دیئے ہیں جل رہا ہے
فطرت کا چلن بدل رہا ہے

شعلوں سے ٹپک رہی ہیں بوندیں
پھولوں سے دھواں نکل رہا ہے

یہ وقت ہے یا کوئی درندہ !
لمحہ لمحہ نگل رہا ہے

سورج کو فلک پہ کون روکے
نکلا ہے ابھی، کہ ڈھل رہا ہے

گردش کے قدیم راستے پر
مہتاب پھسل پھسل رہا ہے

اب ٹوٹ پڑیں گی کائناتیں
گردوں کا ستون گل رہا ہے

برپا ہے وہ سرِ حدِ ابد پر
جو حشر ازل سے ٹل رہا ہے

ذرّے کا مدار جس نے توڑا
بیٹھا ہُوا ہاتھ مل رہا ہے

اِک ہَول سا، سرزمینِ دل پر
آسیب کی طرح چل رہا ہے

انسان، اجل کی گود بھرنے
بچّے کی طرح مچل رہا ہے

جولائی ۱۹۸۱ء

○
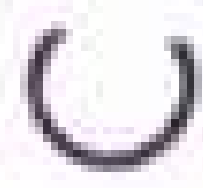
یوں تو ہر دَور میں ڈھالے گئے پیکر کتنے
یار لوگوں نے تراشے ہیں مگر سر کتنے

کہیں دیں ہے کہیں دنیا، کہیں ایماں، کہیں کفر
ایک انسان کے سینے میں ہیں خنجر کتنے

یہ مرا عجز نہیں، وقت کی سفّاکی ہے
دب گئے ہیں مرے اندر مرے جوہر کتنے

میرے دامانِ دریدہ پہ نہ جاؤ لوگو!
صدفِ دل میں لیے بیٹھا ہوں گوہر کتنے

ایک جھونکا ہی اُڑا لے گیا، تنکوں کی طرح
اُن درختوں کو، جو لگتے تھے تناور کتنے

ایک آئینے میں بس ایک ہی چہرہ ہے ندیمؔ
دل ہی جب ایک ہے، ہوں گے مرے دلبر کتنے

جولائی ۱۹۸۱ء

خدا ترس

مرے سینے پہ جو پتھر پڑا ہے
ہٹ تو سکتا ہے
مگر بازو مرے، شل ہیں
مجھے کروٹ بدلنا بھی نہیں آتا
جب اُٹھنا چاہتا ہوں، پسلیاں فریاد کرتی ہیں

ابھی کچھ دیر میں اک شخص آئے گا
کدال اور پھاوڑا لے کر
مجھے دیکھے گا
میری سانس کو محسوس کرنے کے لیے مجھ پر جھکے گا

اور سوچے گا:

ابھی اس کے نفس کی آمد و شد کے تسلسل میں

کوئی رخنہ نہیں ملتا

جو قبر اس کے لیے کھودی گئی ہے

اُس کو کل تک کے لیے محفوظ کر لینا ہی بہتر ہے

کہ زندہ دفن کر دینا

ہمارے مسلکِ تہذیب کی رُو سے

شقاوت ہے!

ستمبر ۱۹۸۱ء

○

مجھے دکھ یہ ہے کہ بہاریں بھی طیور بے پر و بال ہیں
مرے ہمسفر نہ ملول ہوں، یہ ملال میرے ملال ہیں

مری بے کلی سے خفا نہ ہو، مری جستجو کا بھرم نہ کھو
تجھے اک جواب و بال ہے، مرے لب پہ لاکھ سوال ہیں

وہ بھی اک لکیر سی آبجو، یہ ہے چار سو کی فضائے ہُو
وہ گھڑی تھی تیرے وصال کی، یہ فراق کے مہ و سال ہیں

یہ عجیب حسنِ قیاس ہے، کہ جو دور ہے، وہی پاس ہے
یہ تصورات کے واہمے، مرے دشتِ غم کے غزال ہیں

یہ جو عرصہ گاہِ خیال ہے، ترا فن ہے، تیرا جمال ہے
مری شاعری ہو کہ نثر ہو، یہ سبھی ترے خد و خال ہیں

یہ عجب طرح کا تضاد ہے، یہ دل و نظر کا فساد ہے
مرے تجربے ہیں کمال پر، مرے در و رُو بہ زوال ہیں

نومبر ۱۹۸۱ء

ساتویں سمت

میں نے دیکھا کہ اک مجمعِ عام ہے

جو رواں ہے

مگر اس کا سارا سفر بے جہت ہے

شمال اور مغرب، جنوب اور مشرق، زمین اور افلاک سے وہ گریزاں ہے

جیسے خدا نے کسی ساتویں سمت کی آگہی بخش دی ہو اُسے

کوہساروں کو چھو کر انھیں گالا گالا کیے جا رہا ہے

مگر پھول کی پتیوں کے کناروں کی دھاروں سے

پوروں کے پرزے اُڑائے چلا جا رہا ہے

اُدھر اس کے ہونٹوں پہ (اُن سب کے ہونٹوں پہ) نوحہ ہے لیکن وہ نغمہ سا لگتا ہے

آنکھوں میں (اُن سب کی آنکھوں میں) آنسو ہیں لیکن ستارے سے معلوم ہوتے ہیں

ہاتھوں میں (اُن سب کے ہاتھوں میں) خامے ہیں

ہر نوکِ خامہ پہ لفظوں کی شمعیں ہیں

جو ساتویں سمت کی تیرگی میں چراغاں کیے جا رہی ہیں!

نومبر ۱۹۸۱ء

○

آخرِ کار رہِ انجامِ سفر تک پہنچے
تیرے در سے جو چلے، پھر ترے در تک پہنچے

پو جو پھوٹی تو ستاروں کی لویں ٹوٹ گئیں
صرف آنسو شبِ فرقت کے، سحر تک پہنچے

راہ میں قصر بھی، معبد بھی، چمن زار بھی تھے
کن خرابوں سے گزر کر ترے گھر تک پہنچے

اتنا بے بس بھی نہیں ساحلِ بحرِ حالات
موجِ پایاب بھی مچل جائے تو سر تک پہنچے

ہر بشر کو جو خدا پاس بلا لیتا ہے
وہ خدا بھی تو کسی روز بشر تک پہنچے

اک شجر تک بھی نہیں ہے مرے صحرا میں ندیمؔ
اور ضد ہے، کہ مرا ہاتھ ثمر تک پہنچے

نومبر ۱۹۸۱ء

خدیجہ* زندہ ہے

جبینِ شام سے جب تک ستارۂ سحری کی دمک جھلکتی ہے
ہوا کو رہتی ہے جب تک شمیمِ گل کو لٹانے، بکھیرنے کی لگن
گرفتِ دستِ خزاں میں بریدہ شاخ کو جب تک ہے انتظارِ بہار
فرازِ کوہِ انا سے صدائے تیشۂ فرہاد جب تک آتی ہے
جو خامشی کے افق پر دیے جلاتی ہے

---

* خدیجہ مستور

مہک ہے خاک کی جب تک، خیال و خواب کی تا آسماں اُڑان میں بھی

زمیں کے چہرے سے جب تک لہوِ شہید کا گردِ ملال دھوتا ہے

طلسمِ ظلم سے جب تک درِ مقفّلِ دل ٹوٹتا ہے، کھلتا ہے

اِک ایک لفظ میں جب تک دھڑک رہے ہیں ہزاروں نئے نئے مفہوم

چمن میں جیسے شگوفے فلک پہ جیسے نجوم

کلی کے روپ میں جب تک وفورِ نم سے چٹکنے کا عزم زندہ ہے

خلائے تیرہ میں جب تک کئی کروڑ ستاروں کا نظم زندہ ہے

غرض خدا کی خدائی میں حسن و خیر کا جب تک قرینہ زندہ ہے

شبِ حیات میں، سچ کا دیا جلانے کا جب تک سلیقہ زندہ ہے

کمالِ فن کے فلک پر خدیجہ زندہ ہے

اگست ۱۹۸۲ء

○

کاسنانوں کے تماشائی تھے
ہم کبھی لالۂ صحرائی تھے

خول ٹوٹا جو انا کا، تو کھلا
ہم خود اپنے ہی تمنائی تھے

عمر بھر بات ادھوری ہی رہی
اور ہم مخزنِ گویائی تھے

عشق کرتے تھے جنوں کی حد تک
جو بظاہر ہمہ دانائی تھے

ہم، بہ ایں دامنِ صد چاک ندیم
تاجدارِ شبِ تنہائی تھے

ستمبر ۱۹۸۲ء

درد

وجود — احساسِ درد ہی سے
اگر یہ احساس ہی نہ ہو — تو
وجود اپنے عدم کے گہرے میں ڈوب کر
بے وجود ہو جائے!
درد عرفانِ ذات ہے
کائنات کو درد ہی نے چھانا ہے
درد ہی زہرہ و زحل تک رسائی ہے
اور خدائی بھی نورِ درد سے مستنیر ہے
اس کی تابشوں سے
حیات — اور پھر حیات سے ماورائے سب ممکنات روشن ہیں
درد ہے تو جہاں بھی ہے
اور آدمی بیکراں بھی ہے

ستمبر ۱۹۸۲ء

"فاتحینِ بیروت" سے

تمہارے اوجِ تہذیب و ثقافت کا
زمانہ معترف ہے
اور میں بھی معترف ہوں
صرف یہ ننھا سا شکوہ ہے
کہ تم بے خانمانوں کے کلیجوں میں اترتی برچھیوں کو تو عجائب گھر میں
فن کارانہ اندازِ تناسب سے سجاتے ہو
مگر چھلنی کلیجے بھول جاتے ہو!

اکتوبر ۱۹۸۲ء

ممی

گزرتے وقت کے سفاک ہاتھوں سے
حنوطے جاچکے ہیں ہم
ہمارے پیکروں پر
خود ہمارے ہی حوادث کی اڑائی گرد
تہہ در تہہ جمی جاتی ہے
ہم تو دست و بازو کیا ہلائیں گے
مگر طوفاں بھی جیسے راستہ ہی بھول بیٹھے ہیں
کوئی جھونکا بھی ہم تک کب پہنچتا ہے
جو ہم پر ان گنت پرتوں کی صورت میں اترتی گرد کو آکر اڑائے
ورنہ ہم اپنے بدن کے سب مساموں سے
وہ سبزہ پھوٹتا دیکھیں گے
جو قبروں کی مٹی سے نکلتا ہے!

جنوری ۱۹۸۳ء

چاند گھبرا گیا

(فلسطینی پناہ گزینوں کے ٹھکانوں پر حملوں کے پس منظر میں)

چاند نے

ابر کی ایک کھڑکی سے جھانکا

تو گھبرا گیا

اور کھڑکی کے پٹ بند کر کے

گھنے بادلوں کو عبا کی طرح اوڑھ کر

چھپ گیا

بادلوں میں مگر

اس کے چہرے کا سونا پگھلتا رہا

اس کے اشکوں کی چاندی چمکتی رہی

اور فلسطین کی خیمہ گاہوں میں

تہذیب کے پاسبانوں کے دلال

منظر کے دھبّے مٹانے میں

انسانیت کو ٹھکانے لگانے میں

مصروف تھے!

جنوری ۱۹۸۳ء

جوش ملیح آبادی کی یادیں

(چند اشعار)

ہر مرحلے میں، سچ کی جسے جستجو رہی

دل جس کا مرگِ عدل سے شق تھا وہ جوش تھا

ظلمات سے سدا جو نبرد آزما رہا

اُمڈا ہُوا جو سیلِ شفق تھا، وہ جوش تھا

باطن میں نرم دل تھا، مگر جس کے سامنے

چہرۂ غرورِ جبر کا فق تھا، وہ جوش تھا

عصرِ رواں میں، سطوتِ باطل کے رُوبرو

جس کے لبوں پہ نعرۂ حق تھا، وہ جوش تھا

اس دَور کے صحیفۂ حسن و حیات میں

جو رنگ و روشنی کا ورق تھا، وہ جوش تھا

۰ اپنی ذات میں تھا محبت کی انجمن

فن میں بھی جو طبق بہ طبق تھا، وہ جوش تھا
یوں تو بڑے بڑوں کو ہے پندارِ شاعری
اس دشت کا جو خطِ افق تھا، وہ جوش تھا

فروری ۱۹۸۳ء

ہوا کی دعا

وہ آندھیاں، جو کسی دشت سے اُٹھیں گی کبھی
نہ جانے کون سے لمحے کے انتظار میں ہیں
کہ خاک ذخس سے اَٹا جا رہا ہے شہر کا جسم

شدید دھوپ بھی ہے، کربِ انجماد بھی ہے
کہ وہ ہوا، جو کبھی ڈالیوں میں گاتی تھی
کسی نشیب میں اتری ہوئی ہے برسوں سے

ہوا چلے تو تموّج کا حشر پیدا ہو!
اسی کے دم سے سمندر کی سانس چلتی ہے
اسی کے رم سے روانی، اسی کے نم سے نمو

ہوا چلے تو دماغوں میں لہلہائیں سوال
ہوا چلے تو کسی چیخ کا جواب آئے
ہوا چلے تو پہاڑوں کو گونج کی سوجھے

ہوا کے نام پہ اک برگ بھی نہیں ہلتا
تمام درد ہیں سینے، تمام گرد ہیں ذہن
ضمیر سر بگریباں، حیات شرمندہ

اگست ۱۹۸۳ء

ہبُوط

زمیں کے گرد ان دیکھی ہواؤں کی فصیلیں ہیں
کوئی اوپر سے آئے گا تو ٹکرائے گا ان سے اور بھسم ہو جائے گا
جس طرح مسجودِ ملائک جب زمیں کی سمت آیا تھا
تو مس ہو کر ہواؤں سے
فضا میں جل بجھا تھا
اس کا جو ٹکڑا سلگتا رہ گیا تھا
اور زمیں پر گر گیا تھا
اس کو ہم انسان کہتے ہیں

دسمبر ۱۹۸۳ء

پناہ

خزاں میں پتھروں پر کہر جمتی ہے

تو آئینے بکھر جاتے ہیں

تا حدِ بصارت

سنگ زاروں میں

اور اِن میں آسماں کے عکس

بٹ جاتے ہیں ٹکڑوں میں

ابابیلوں کے پر اک آئینے میں سے گزرتے ہیں

تو دھڑ اِک اور میں ہے

اور خود رو جھاڑیوں کے ننھے منے پھول

اونچے آسمانوں اور فضا میں چارسو اُڑتی ابابیلوں پہ

اتنے ٹوٹ کر ہنستے ہیں

جیسے رفعتوں نے

وقت کی یلغار سے بچنے کو

آغوشِ زمیں میں سر چھپایا ہو

دسمبر ۱۹۸۳ء

گریہ

بہت مدّت سے

آنکھوں کی نمی

جب بے تموّج، بے تلاطم ہے

تو اس پہ

بے حسی کی کائی جمنے ہیں

اگر کوئی رکاوٹ ہے

تو وہ شاید

مرے باطن کا گریہ ہے!

دسمبر ۱۹۸۳ء

"کُن" کے قریب کا ایک لمحہ

ہر سمت خلائے بیکراں ہے
تا حدِّ نظر دھواں دھواں ہے
ظلمات کا ایک دائرہ ہے
جو مثلِ سکوت گونجتا ہے
جھگڑا ہی نہیں ہے کفر و دیں کا
"ہے" پر بھی گمان ہے "نہیں" کا
کچھ ہے تو وہی ہے جو نہیں ہے
اور وہ جو نہیں ہے، ہر کہیں ہے

ناگاہ سکوت ٹوٹتا ہے
ظلمات سے نور پھوٹتا ہے

ہیجان سا آ گیا فضا میں
طوفان سا اُمڈ پڑا خلا میں
معلوم نہیں اُٹھے کہاں سے
شعلے ہیں تمام بے اماں سے
اُٹھے تو جھکے نہیں ابھی تک
لپکے تو رُکے نہیں ابھی تک
یہ گردشِ مُو قلم عجب ہے
بیتابیِ پیچ و خم عجب ہے

خوابوں میں خیال تُل رہے ہیں
تخلیق کے باب کُھل رہے ہیں

جنوری ۱۹۸۳ء

○

بھلا کیا پڑھ لیا ہے اپنے ہاتھوں کی لکیروں میں
کہ اس کی بخششوں کے اتنے چرچے ہیں فقیروں میں

کوئی سورج سے سیکھے، عدل کیا ہے، حق رسی کیا ہے
کہ یکساں دھوپ بٹتی ہے صغیروں میں کبیروں میں

ابھی بچھڑوں کے دکھ پر بھیگنا بھولی نہیں آنکھیں
ابھی کچھ روشنی باقی ہے لوگوں کے ضمیروں میں

نہ وہ ہوتا، نہ میں اک شخص کو دل سے لگا رکھتا
میں دشمن کو بھی گنتا ہوں محبت کے سفیروں میں

سبیلیں جس نے اپنے خون کی، ہر سُو لگائی ہوں
میں صرف ایسے غنی کا نام لکھتا ہوں امیروں میں

بدن آزاد ہیں، اندر مگر زنجیر بجتی ہے
کہ میں مختار ہو کر بھی گنا جاؤں اسیروں میں

اکتوبر ۱۹۸۴ء

○
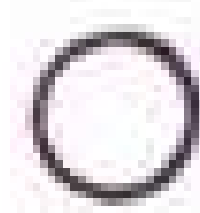
بارش کو بلا رہا ہوں کب سے
میں خاک اُڑا رہا ہوں کب سے

ہر شاخ ہے برگ و بر سے خالی
اشجار اُگا رہا ہوں کب سے

دیوار میں رخنہ پڑ گیا تھا
اک خشت جما رہا ہوں کب سے

گرداب میں سر اٹھا اٹھا کر
ساحل کو بلا رہا ہوں کب سے

پوٹ ناک
١٧٦

اک سمت کی جستجو کی دھن میں
ہر سمت کو جا رہا ہوں کب سے

اِک پل نہیں رکتی یاد اس کی
میں جس کو بھلا رہا ہوں کب سے

چہرے ہی نہیں جو منعکس ہوں
آئینے دکھا رہا ہوں کب سے

جنوری ١٩٨٥ء

درپن

آئینہ فریبی ہے
عکس جو بھی پڑتا ہے
ڈگمگانے لگتا ہے
تلملانے لگتا ہے

میرے قد کو یوں کھینچا
جیسے آسمانوں کو
چھو رہا ہو سر میرا
اور ایک پیپل کو
اس طرح سکیڑا ہے
جیسے وہ حقیقت میں
صرف ایک پتّا ہے
آئینہ فریبی ہے

لیکن ایک چہرے کی
اس پہ حکمرانی ہے
عکس اس کا پڑتے ہی
جھلملانے لگتے ہیں
ہونٹ اس کے، گال اس کے
جگمگانے لگتے ہیں
خوش جمال اس کے
اور سمندر آنکھوں میں
بیکراں جلال اس کے
سارے خد و خال اس کے
حد یہ ہے، خیال اس کے
یعنی سب کمال اس کے!

جنوری ۱۹۸۵ء

○
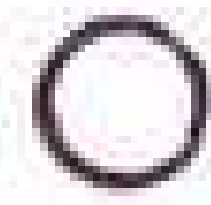
کہنا چاہوں، مگر اے کاش کبھی کہہ پاؤں
آسمانوں سے اُتر آ کہ تجھے اپناؤں

چھان ڈالی ہے زمیں، اور فضا اور خلا
ہیں تری کھوج میں نکلوں تو کہاں تک جاؤں

ختم ہوتی نظر آئیں ابدیت کی حدیں
اس سے آگے میں خیالوں کو کہاں پہنچاؤں

تو نے ہر عدل قیامت پہ اُٹھا رکھا ہے
اے خدا، میں ترا معیار کہاں سے لاؤں

دُھن یہ رہتی ہے کہ صحراؤں کی جھولی بھرنے
کوہ سے چھین کے اک آدھ گھٹا لے آؤں

کب خزاں ان کو ہرا ہونے کی عزت دے گی
زرد پتوں میں اگر اپنا لہو دوڑاؤں

میں بھڑکتا ہوں تو صیاد کا کیا جاتا ہے
اپنے ہی خون سے میں اپنا ہی جی بہلاؤں

وہ یہ کہتے ہوئے، پگھلا ہوا زر پی جائے
شاید اس طرح کبھی صاحبِ فن کہلاؤں

جنوری ۱۹۷۵ء

مشرق و مغرب

(خونِ رواں کے آئینے میں)

جبینوں پر ندامت کا پسینہ ہے
کہ جیسے ان کا اک قطرۂ خوں
ان کے بے غیرت وجودوں کی گواہی دینے آیا ہے

لبادوں میں چھپاتے پھر رہے ہیں اپنے ہاتھوں کو
جو رعشے کے تواتر سے سنبھالے بھی نہ سنبھلیں

اور یہ رعشہ

بہت کچھ کر دکھانے کے عزائم
اور کچھ بھی کر نہ سکنے کی گواہی ہے

لوحِ خاک
۱۸۲

گواہی کی سزا سے کون اب تک بچ سکا ہے
اور یہ سچی گواہی
وقت ہے
تاریخ ہے
اور یہ حقیقت ہے
کہ انساں کچھ بھی ہو
آخر وہ مسجودِ ملائک ہے!

جنوری ۱۹۸۵ء

○
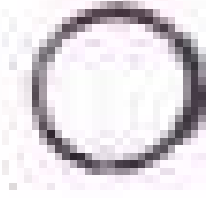
خدا تو خیر خدا ہے، بشر نہیں ملتا
ثمر کہاں سے ملے جب شجر نہیں ملتا

کھڑا ہوں سر پہ رکھے دو جہاں کا رختِ سفر
کوئی بحدِّ نظر ہمسفر نہیں ملتا

عجب صدی ہے کہ بے چہرہ ہو گئی مخلوق
مجھے کسی کے بھی شانوں پہ سر نہیں ملتا

اسیر رہتے ہیں حالات کی چٹانوں میں
وہ آئنے، جنھیں آئینہ گر نہیں ملتا

اسی لیے تو جو کل حال تھا، وہ آج بھی ہے
کسی دعا کا ثبوتِ اثر نہیں ملتا

ندیمؔ یوں صدفِ لفظ کے گہر نہ لٹا
یہاں تو کوئی بھی صاحب نظر نہیں ملتا

جون ۱۹۸۵ء

ایک ویران دن کے نام

رات نے دن کو روندا ہے، پامال کیا ہے
ورنہ سورج اتنا میلا میلا کیوں ہوتا
مٹیالا سا، پیلا سا، یرقان زدہ سا
سورج، جس سے سیاروں نے نور لیا تھا
اور توانائی حاصل کی تھی
سورج، جس نے ہر شے کو روئیدہ اور بالیدہ کیا تھا
سورج، جو صدیوں پیچھے، معبود بھی تھا
اب اتنا لاغر لگتا ہے
جس طرح کسی مزدور کا چہرہ
جس پہ مسلسل محنت اور مسلسل فاقوں نے
حالات کے آڑے سیدھے خاکے کاڑھ دیے ہوں!

ستمبر ۱۹۸۵ء

○
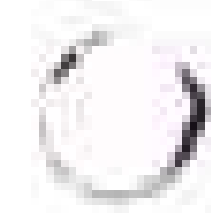
شامِ فراق ایک عجب تجربہ ہُوا
جھونکا چلا تو جیسے ترا سامنا ہُوا

کیا جانے اُس کا کوئی ہدف ہے بھی یا نہیں
انساں ہے ایک تیر ازل سے چلا ہُوا

شبنم چمک اُٹھی کفِ گل پر کچھ اس طرح
جیسے زمین پر ہو ستارا پڑا ہُوا

پہلے وہ رنگ رنگ تھا، اب گرد گرد ہے
یہ برگِ خشک ہے کہ نگر ہے لُٹا ہُوا

شہراہِ شب پہ راہنماؤں کی بھیڑ تھی
ہر ہاتھ میں چراغ تھا لیکن بجھا ہُوا

اس دور میں جنوں کے بھی تیور بدل گئے
مجنوں چھپا رہا ہے گریباں سِلا ہُوا

جب انتظار حد سے گزرنے لگا ندیمؔ
میں نے سنا سکوت کو بھی بولتا ہُوا

اکتوبر ۱۹۸۷ء

میرے روز و شب

بس اب تو یہ روز و شب ہیں میرے
کہ صبح سے شام تک خود اپنا لہو جلاتا ہوں
اس بہانے
خود اپنی ہی آگ تاپتا ہوں

کبھی اگر عدل کے کلیجے میں خنجر اُترے —
کبھی اگر بولتے ہوئے ہونٹ سل کے رہ جائیں —
اور آنکھوں کی سیپیوں سے
جھٹک دیے جائیں
اَن گنت تپلیوں کے موتی —

لہو نمائی

۱۸۸

خدا اگر آدمی سے اک بار اور روٹھے

تو میرے اندر لہو کے شعلے بلند ہوتے ہیں

اور میں بجھتے بجھتے اکثر یہ سوچتا ہوں

کہ میرے باطن میں روز و شب کوئی ذبح ہوتا ہے

ورنہ آخر کہاں سے اُبلے میرے بدن میں لہو کے چشمے

کہ آسمانوں کے عکس بھی ان کے آئنوں میں لہو لہو ہیں

اکتوبر ۱۹۷۵ء

○

طلوعِ صبح کا الزام میرے سر آیا
کنوئیں کی تہہ سے مجھے آسماں نظر آیا

صدا ذرا سی بھی، اس خامشی میں حادثہ تھی
خود اپنے دل کے دھڑکنے سے مجھ کو ڈر آیا

میں دشت و کوہ میں ہوں یا خود اپنے آنگن میں
نکل کے گھر سے نہیں در اصل اپنے گھر آیا

یہ ایک اشکِ ندامت مجھے ڈبو ہی نہ دے
سمندروں سے تو میں بے خطر گزر آیا

اس آدمی کے شعور و غرورِ ذات سے ڈر
انا بچا کے جو افلاک سے اُتر آیا

میں زیرِ تربیتِ زندگی رہا برسوں
فقط لحد میں اُتر جانے کا ہنر آیا

سفر میں سر پہ برستے رہے ببول کے پھول
ندیمؔ یوں مرے قبضے میں تاجِ زر آیا

اکتوبر ۱۹۸۷ء

ایک اُداس لمحے کی نظم

اب لاؤں کہاں سے بساطِ حیاتِ گم گشتہ
وہ بساط جو بچھتی تھی تو افق سے افق تک پھیلتی جاتی تھی
اور اس کا ہر خانہ میدانِ وغا تھا
جس میں مردوں کے رَن پڑتے تھے
اور کشتوں کے پشتوں پر پشتے لگتے تھے

وہ فرصتِ عشق کہاں سے لاؤں
جس نے کل آفاق کے چاروں گوشوں کو آپس میں ملا کر
گرہ لگا دی تھی
اور پورے نظامِ کون و مکاں کو
گیند بنا کے اُچھال دیا تھا

اب وہ یقیں، وہ صلابت کہاں سے لاؤں
جس کے دم سے ہر پل دائمی لگتا تھا
ہر شے با معنی ہوتی تھی

اب دھند ہے
اور سناٹا ہے
اور نا معلوم مسافت ہے
اور دُور آفاق پہ لکھی ہُوئی
اک بے مفہوم عبارت ہے

جنوری ۱۵۸۹ء

(نذرِ یگانہ)

○
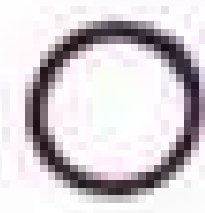
ایک بار پھر ہم کو حکمِ انتظار آئے
ایک بار پھر دل کو بے سبب قرار آئے

تیرے ہجر میں ہم نے، نفیِ وقت کی کر دی
رات کیا گزاری ہے، زندگی گزار آئے

اب سکوں سے جینے کا، اپنے پاس گُر یہ ہے
رو لیے کہیں چھپ کر، اور تھکن اُتار آئے

کاروبارِ الفت میں نقد تھا ہر اک سودا
ہم جو خالی ہاتھ آئے، اپنی جاں ہی وار آئے

۱۹۴

ابتدائے عالم سے، آدمی کے دامن میں
صرف چار لمحے ہیں، وہ بھی مستعار آئے

ہم بساطِ دنیا کے کچھ عجب کھلاڑی تھے
کائنات کی خاطر، اپنی ذات وار آئے

صرف ایک سُورج ہی روشنی نہیں دیتا
صدیاں جگمگا اُٹھیں، جب فرازِ دار آئے

فروری ۱۹۸۶ء

آثارِ قدیمہ

معماروں کے میناروں کی بنیادوں کو
شورِ زمیں نے چاٹ لیا ہے
اب تو صرف اک جنبش سے
صرف ایک ذرا سے جھٹکے سے
تہذیبوں کو
پیوندِ زمیں ہو جانا ہے

پھر صدیوں بعد
ان کے آثار کا کھوج ملے گا
اور ہمارے صدیوں بعد کے بچے
ان کی اک اک خشت پہ

تاریخوں کے صحیفے رقم کریں گے
اور کہیں گے:
آج سے کتنی صدیاں پہلے
کاغذ کے میناروں پر بلّور کی چھتیں سجا کر
لوگ سمجھتے تھے
تعمیر کا فن معراج پہ جا پہنچا ہے!

فروری ۱۹۸۶ء

لذّتِ آگہی

میں عجیب لذّتِ آگہی سے دوچار ہوں
یہی آگہی مرا لطف ہے، مرا کرب ہے
کہ میں جانتا ہوں

میں جانتا ہوں کہ دل میں جتنی صداقتیں ہیں
وہ تیر ہیں
جو چلیں تو نغمہ سنائی دے
جو ہدف پہ جا کے لگیں تو کچھ بھی نہ بچ سکے
کہ صداقتوں کی نفی ہماری حیات ہے!

مرے دل میں ایسی حقیقتوں نے پناہ لی ہے
کہ جن پہ ایک نگاہ ڈالنا
سورجوں کو بطونِ جاں میں اُتارنا ہے!

میں جانتا ہوں
کہ حاکموں کا جو حکم ہے

وہ دراصل عدل کا خوف ہے

وہ سزائیں دیتے ہیں

اور نہیں جانتے

کہ جتنی سزائیں ہیں

وہ ستم گری کی روایتیں ہیں

مجھے علم ہے

یہی علم میرا سرور ہے

یہی علم میرا عذاب ہے

یہی علم میرا نشہ ہے

اور مجھے علم ہے

کہ جو زہر ہے

وہ نشے کا دوسرا نام ہے!

میں عجیب لذتِ آگہی سے دوچار ہوں!!

جون ۱۰۸۶ء

○
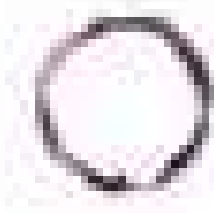
شفق غبار بنی، اور کوچ کرنے لگی
جبینِ وقت پہ گردِ سفر اترنے لگی

خدا گواہ، ستم گر جری نہیں ہوتا
گجر پہ ضرب پڑی اور رات ڈرنے لگی

زمیں نے پہلے تو نورِ سحر میں غسل کیا
پھر آفتاب کے آئینے میں سنورنے لگی

وہ جیسے جنس زدوں کے مزار ڈھونڈتی ہے
قدم قدم پہ نگارِ صبا ٹھہرنے لگی

غزال ساتھ تھے، لیکن شغال تاک میں تھے
حیات جب کسی گلزار سے گزرنے لگی

شبِ وصال کا آغاز ہی قیامت تھا
ندیمِ وقت کی گردش طرارے بھرنے لگی

اگست ۱۹۸۶ء

○

دل میں محبت درد کے پیڑ اگاتی رہی
صحرا سے پھولوں کی خوشبو آتی رہی

حبس جو ٹوٹا، مجھے ہوا نے سمیٹ لیا
دیر تلک پھر ماں کی طرح لپٹاتی رہی

رات کو جیسے فرشتے چھت پہ اُترتے رہے
بوندوں میں قدموں کی سی چاپ آتی رہی

جب کوئی پتّہ ٹوٹ کے جانبِ خاک چلا
شاخ وداعی رنگ میں ہاتھ ہلاتی رہی

جیسے کوئی در پر دستک دیتا ہو
دل کی دھڑکن شب بھر مجھ کو جگاتی رہی

تجھ سے بچھڑ جانے کے بعد اس لمحے تک
کونج سی اک میرے اندر کُرلاتی رہی

وہ جو ندیم نے صبحِ ازل سے سیکھا تھا
بس وہی نغمہ ہجر کی رات سناتی رہی

ستمبر ۱۹۸۶ء

ترقّی یافتہ

ساحلِ زیست پہ ہم سیپیاں چننے پہنچے
جھولیاں بھر کے جو پلٹے
تو صدا آئی
کہ ان سب سیپیوں میں
وہ جو موتی سے نظر آتے ہیں
جرثومے ہیں

تم نے جب زیرِ زمیں جوہرِ ذرّہ توڑا — تو اسی آن یہیں
موتی بننے کے لیے سیپیوں میں جتنے بھی قطرے اُترے
وہ چمکتے ہوئے جرثومے بنے
کہ جب انساں کا دماغ
اپنی ہی نسل کو جرثومہ بنا کر رکھ دے
سیپیاں، موتیوں کے نور کا ناموس بچائیں کیسے!

ستمبر ۱۹۷۶ء

○
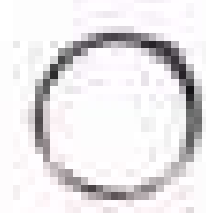
آئینے میں بھی وہ حیرت نہ رہی
جب حقیقت ہی حقیقت نہ رہی

جب سے آنکھوں میں کھٹکنے لگی ریت
میرے صحراؤں میں وسعت نہ رہی

عشق، تہذیب میں زنجیر ہُوا
کوئی شدت، کوئی حدت نہ رہی

جانے اب تک ہے خدا کیوں تنہا
کوئی خلوت بھی تو خلوت نہ رہی

مسکراؤں بھی تو کس برتے پر
اب تو رونے کی بھی فرصت نہ رہی

اب تو تیور ہی بلک اُٹھتے ہیں
آہ و فریاد کی حاجت نہ رہی

خود سے بیگانہ ہُوا ہوں جب سے
مجھ کو تجھ سے بھی محبت نہ رہی

اتنا پامال ہُوا ذوقِ تسلیم
زخم کھانے میں بھی لذت نہ رہی

ستمبر ۱۹۸۶ء

○
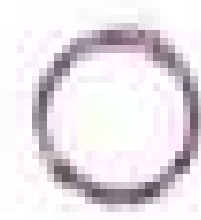
مرے لیے مرے غم بھی خدا کی رحمت ہیں
یہ میری عصمتِ کردار کی ضمانت ہیں

جو دشمنی پہ تُلے ہیں، وہ جانتے ہی نہیں
کہ میرے ظاہر و باطن فقط محبت ہیں

مری شکست کا آغاز میرے گھر سے ہُوا
یہ اور بات کہ دیوار و در سلامت ہیں

میں جب بھی آئنۂ زندگی میں جھانکتا ہوں
جو آدمی نظر آتے ہیں، نقشِ حیرت ہیں

جو چہرہ سامنے آیا، وہ سامنے ہی رہا
زوالِ عمر کے دن کتنے خوبصورت ہیں

جنوری ۱۹۸۷ء

نمائش گاہ

میں ایک عجیب و غریب نمائش گاہ سے ہو کر آیا ہوں
یہ کٹے سروں، بے نور آنکھوں کی نمائش ہے
یہ آنکھیں کتنی سفاکی سے میرے اندر جھانکتی ہیں

جس سمت بھی جاؤں
میرے تعاقب میں ہیں یہ ظالم آنکھیں
(وہ لوگ جنھوں نے سر کاٹے، کیوں آنکھیں کاٹنا بھول گئے)

ان سب کے پپوٹے ساکت ہیں
اور پتلیاں جیسے کسی کو مرتا دیکھ رہی ہیں
(مرے ہوئے، ہر چیز کو مرتا دیکھتے ہیں)

لوحِ خاک
۲۰۷

میں ابھی ابھی اس کٹے سروں کی نمائش گاہ سے نکلا ہوں
رہگیر مگر میری جانب کتنی حیرت سے دیکھتے ہیں
پھر آنکھیں پھاڑے آپس میں سرگوشیاں کرتے ہیں اور کہتے ہیں:
یہ شخص سروں کی نمائش میں
اپنا سر ہی بھول آیا ہے!

فروری ۱۹۸۷ء

ضربِ مسلسل

جب کلہاڑے کی چوٹ تنے پر پڑتی ہے
تو سارا درخت
جڑوں سے لے کر دور فلک کو چھوتی ہوئی پھننگوں تک
کانپ اٹھتا ہے
ایک اک ٹہنی
ایک اک پتّا
ہر چوٹ کے ساتھ لرزتا ہے
اور کلہاڑے کی ضرب
بڑے سفّاک تواتر سے
گونج اٹھتی ہے

یہ کافر نسب
زمیں کا، اور زمیں پر بسنے والوں کا
دلدوز مقدّر ہے

اور میں بھی
سبز درختوں اور حسین انسانوں سے آباد زمیں کا
ایک ادنیٰ باشندہ ہوں!

مارچ ۱۹۸۷ء

بھنور

عجب بھنور ہے
کیسی کیسی شکلیں اس میں بنتی اور سنورتی ہیں
اور پھر اک دائرے کے محرابی دروازے سے نکل کر
سارے دریا کو آغوش میں لے لیتی ہیں
سطحِ آب پہ جیتے جاگتے شہر آباد نظر آتے ہیں!

عجب بھنور ہے
لمحہ بہ لمحہ حلقہ بہ حلقہ پھیلے جاتا ہے
اور گھومے جاتا ہے
جس طرح کسی نے
گُوندھی مٹی چاک پہ رکھ کر
اک اُنگلی یا اِک تنکے سے
تاریخِ تخلیق مصوّر کو دی ہو!

مارچ ۱۹۸۷ء

آیندہ صدی کا انسان

(جوہری جنگ کے خوفناک امکان کے تناظر میں)

مری صدا پر گرفت شب ہے
میں پوری شدّت سے چیخ کر بھی
سنائی دیتا نہیں کسی کو
مری بصارت کو تیرگی جذب کر رہی ہے
کہ ہر طرف دیکھنے کی خواہش میں
میں نے آنکھوں کی پتلیاں توڑ پھوڑ دی ہیں
مری سماعت سکوت کی ایک گونج ہے
اور مرا دماغ ایک کوششِ رائیگاں ہے ریشم کے
اُلجھے گچھے کو کھولنے کی ،

کہ میں نے اکیسویں صدی کو
ضمیر کے آئینے میں دیکھا ہے
اور انسان کو
کچھ ایسا نڈھال پایا ہے
جیسے سرسبز پیڑ کی شاخ
تیز جھونکوں کی زد میں آ کر
لٹک پڑی ہو!

مارچ ۱۹۸۷ء

بھکارن

ابھی لوگ پوری طرح جاگتے بھی نہیں
جب وہ آتی ہے
اِک اِک گلی میں صدائیں لگاتی ہے
دو چار ایسے بھی در ہیں
جنھیں کھٹکھٹاتی ہے
پھر جیسے دن کے سمندر میں غوطہ لگاتی ہے
اور ڈوب جاتی ہے!
لیکن ابھی صبح پوری طرح سے چمکتی نہیں

جب وہ جیسے زمیں سے اُگ آتی ہے
پھر سے صدائیں لگاتی ہے
ہر بار صرف اِتنا کہتی ہے :
مجھ کو خدا چاہیے
اے خُدا کے بہت نیک بندو!
فقط ایک پل کو تمھارا خدا چاہیے
اُس خدا نے مجھے جو حیا دی
اُسے ڈھانپنے کے لیے اِک ردا چاہیے

جون ۱۹۸۷ء

یقیں نہیں آتا

(ایک دوست کا نوحہ)

اپنے دوست کی موت کا مجھے یقیں نہیں آتا
انساں جب سے پیدا ہُوا ہے، زندہ ہے،
اور زندہ رہے گا
وہ جو برسوں پہلے ایک انسان ادھر سے گزرا تھا
وہ میرا دوست تھا
جو اب برسوں بعد ادھر سے کچھ یوں گزرے گا

---

٥ خان حمید اللہ خان نیازی، کلّہ خیل — جن کے نام میں نے اپنے قطعات کا مجموعہ "رم جھم" منسوب کیا تھا —— ندیم

جیسے وہ پہلی بار اِدھر سے گزرا ہے
انسان تو ایک تسلسل ہے
وہ اپنے ماضی، اپنے حال اور اپنے مستقبل میں
نسلوں اور زمانوں میں بٹ کر بھی زندہ رہتا ہے
میں چاہوں تو کتنی صدیوں پہلے کے انسان کو چھو لوں،
اس کو گلے لگا لوں،
جیسے ابھی ابھی جب میں نے اپنے دوست کی موت
کی خبر سُنی
تو میری آنکھیں اس کی تلاش میں حدِ ابد تک جا پہنچیں
پھر میں نے اسے پکارا تو وہ مجھ سے لپٹ کر بولا
'میں بھی کب سے تجھے پکار رہا تھا!'

جون ۱۹۸۷ء

قطعات

(۱)

گندم کی بالیوں میں جڑے ہیں لہو کے نگ
فصلیں اُگی ہوئی ہیں کہ لاشوں کے شہر ہیں
رنگوں کی یہ بہار ہے یا حشرِ رنگ ہے
اوپر سے کھیت سبز ہیں، اندر سے زہر ہیں

(۲)

واعظ کا طعن سُن کے، کہا اک فقیر نے
کچھ کم نہ لیں گے ہم تو بہشتِ نعیم سے
بخشش نہ مل سکی تو نہ ہاریں گے حوصلہ
خیرات مانگ لیں گے خدائے کریم سے

(۳)

اس ظلمتِ مہیب کا کس سے گلہ کروں
تاریک رہگزار میں جگنو کہاں سے آئیں
بربت جو منجمد ہے تو دریا بھی خشک ہے
دل سرد ہو چکا ہو تو آنسو کہاں سے آئیں

(۴)

بارش برس گئی تو ہرے ہو گئے درخت
مدت سے تشنہ لب تھی جو مٹی، مہک گئی
کیوں طعنہ زن ہے موسمِ باراں کے باب میں
چڑیا جو گھونسلے سے نکل کر بھٹک گئی

(۵)

یا بجھ گئے چراغ ہمارے وقار کے
یا ہم صراطِ حق و صداقت سے ہٹ گئے
تاریخ کہہ رہی ہے "سفر مبرا رک گیا!"
تہذیب رو رہی ہے "مرے پاؤں کٹ گئے!"

(٦)

ہم سب کو خونِ تازہ انھی نے عطا کیا
رنگت اس لیے تو کسانوں کی زرد تھی
وہ شہزادیوں کی بنی جب ردا دیا!
دہقان لڑکیوں کے سروں پہ جو گرد تھی

فروری ۱۹۸۱ء

(۷)

ہر لحظہ عجیب آ رہا ہے
ہر لمحہ مہیب آ رہا ہے
آغاز کی سمت جا رہا ہوں
انجام قریب آ رہا ہے

مئی ۱۹۸۱ء

متفرق

وہی تاجر ہیں سرافراز جو اس منڈی میں
نقدِ ایماں کے عوض لقمۂ تر تک پہنچے

✤

ہیں تو سیرِ کوہ میں یہ سوچ کر سرشار ہوں
پتھروں میں دب کے بھی روئیدگی جاری رہی

✤

احباب دُور اندیش ہیں، بھولے نہیں
جب بولنے کا وقت تھا بولے نہیں

✤

ہر پھول اپنے رنگ کے مرقد میں دفن تھا
خوشبو بھی جب چمن سے سدھاری، ہوا کے ساتھ

✤
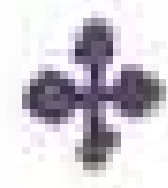
کسی بھی مصحفِ رخ کو پڑھوں تو کیسے پڑھوں
کہ حرف مٹ سے گئے ہیں تمھارے نام کے بعد

شبِ سیاہ کا تریاق پا لیا میں نے
ندیمؔ دل میں چمکتا ہے درد، شام کے بعد

✤

وقت اک پل کو جو رک جائے تو احساں اس کا
چند یادیں مرے دل میں سے گزرنا چاہیں

✤
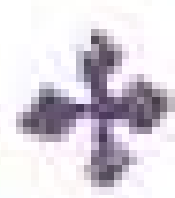
دعوۂ عشق میں تم حد سے نکل جاتے ہو
وقت پڑتا ہے تو کیوں رنگ بدل جاتے ہو

✤
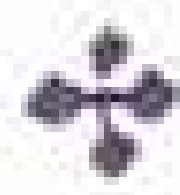
وہ لمس کی حدّت ہے نہ جذبے کی وہ شدّت
اے گل، تو حریفِ لبِ گل رنگ نہیں ہے

✤
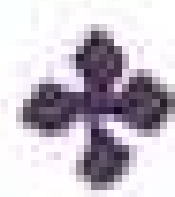
وفا کی دھوپ میں جب جل بجھا وجود مرا
میں رخشِ ریگِ رواں پہ سوار ہو کے چلا

✤

ختم گر ہو نہ سکی عذر تراشی تیری
اِک صدی تک تجھے جینے کی دعا دے دوں گا!

✤
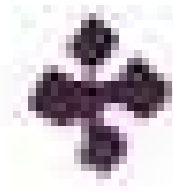
میری یادوں کا سفینہ ہے سلامت اب تک
گو مری راہ میں حائل تھے سمندر کتنے

✤
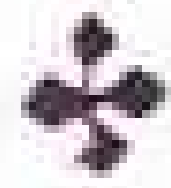
ندیم میرے جلو میں تھی نسلِ مستقبل
میں صرف ایک تھا اور بے شمار ہو کے چلا

میں کشتی میں اکیلا تو نہیں ہوں
مرے ہمراہ دریا جا رہا ہے